کیا اسلام کے مذہبی خدا
(یعنی اللہ)
کا کوئی وجود ہے؟

پیشکش

پاکستانی فری تھنکرز فیس بک گروپ

ویب سائیٹ

https://atheism-vs-islam.com

پیشِ لفظ

اس کتابچے کی تالیف کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے تصورِ خدا (یعنی اللہ) کے وجود سے جڑی بحث کو ایک قطعی اور حتمی نتیجے تک پہنچانا ہے۔

کسی حتمی نتیجے تک پہنچانا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے اور عملی طور پر نا ممکن ہی ہے، مگر پھر بھی امید ہے کہ یہ کتابچہ پڑھنے کے بعد آپ خود کو مزید تشنہ محسوس نہیں کریں گے۔

ذیل میں دیے گئے مضامین اس فکری گتھی کو سلجھانے میں آپ کی مدد کریں گے:

- **آخر تخلیق کیوں؟** (کیا اللہ واقعی اس سوال کا جواب دے پایا؟)
- **آخر امتحان کیوں؟** (عدلِ الہیٰ اور انسانی آزمائش کے تضادات کا تجزیہ)
- **جبر و اختیار کا المیہ:** (تقدیر اور فری وِل کے متصادم عقائد کی منطقی حقیقت)
- **اخلاقیات کا ماخذ:** (مذہب یا پھر انسان خود)
- **مذہبی مفکرین کے دعوؤں کا تجزیہ:** (خدا کے بغیر اخلاقیات ممکن نہیں)
- **خدا کے بغیر زندگی کے معنی:** (کیا اسلام ترک کرنے پر زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے؟
- **خدا کے بغیر انصاف:** (خدا کے بغیر طاقتور کے مظالم کا حساب کون لے گا اور انصاف کیسے ہو گا؟)
- **خدا کے بغیر مشکل حالات کا سامنا:** (بیماری اور موت اور مصائب میں انسان کس کو آواز دے، کس کا آسرا پکڑے؟)

فہرستِ مضامین

آخر تخلیق کیوں؟

جب ہم کائنات اور اس کے خالق کے حوالے سے بحث کرتے ہیں، تو دو بالکل مختلف نقطہ نظر سامنے آتے ہیں:

1. ہمارا موقف (منطقی و سائنسی نقطہ نظر)

ہمارا مؤقف 2 نکات پر مشتمل ہے:

1. اب تک کے تمام مشاہدات اور شواہد کی روشنی میں ہمارا موقف یہ ہے کہ آسمان میں کسی ایسے خدا کا وجود نہیں جو کائنات کے معاملات کو براہِ راست چلا رہا ہو۔
2. یا اگر کوئی خدا موجود بھی ہے جس نے اس نظام کی ابتدا کی، تو وہ اس کے چلنے کے اصولوں (Laws of Physics) میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ ہرگز کوئی **"مذہبی خدا"** نہیں ہو سکتا، کیونکہ تمام مذاہب کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ ان کا خدا روزمرہ کے امور میں ایکٹیولی (Actively) عمل دخل دیتا ہے۔

2. مسلم علماء کا موقف (مذہبی دعویٰ)

ان کا دعویٰ ہے کہ صرف ان کا ہی "مذہبی خدا (یعنی اللہ)" آسمان میں موجود ہے، جس نے کائنات اور انسان کو ایک خاص مقصد کے تحت تخلیق کیا اور وہ اس نظام میں ہر لحہ ایکٹیولی عمل دخل دیتا ہے۔

اب چونکہ یہ دعویٰ ان مسلم علماء کی طرف سے ہے کہ آسمان میں صرف ان کا ہی مذہبی خدا (اللہ) موجود ہے، تو اب اس لیے اس کا ثبوت فراہم کرنا بھی ان کی ذمہ داری (Burden of Proof) ہے۔

مسلم علماء کے جال میں نہ پھنسیں:

ہو سکتا ہے کہ ایتھیئسٹ کمیونٹی میں بہت سے لوگوں کا رجحان اس بات کی طرف ہو کہ آسمانوں میں سرے سے کوئی خدا ہے ہی نہیں، مگر یہ اہم ہے کہ ہم یہ دوسرا نکتہ بھی اپنے مؤقف کے طور پر ساتھ میں پیش کریں کہ:

- یا اگر کوئی خدا موجود بھی ہے جس نے اس نظام کی ابتدا کی، تو وہ اس کے چلنے کے اصولوں (Laws of Physics) میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ ہرگز کوئی **"مذہبی خدا"** نہیں ہو سکتا، کیونکہ تمام مذاہب کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ ان کا خدا روزمرہ کے امور میں ایکٹیولی (Actively) عمل دخل دیتا ہے۔

ورنہ ہوتا یہ ہے کہ مذہبی حضرات پوری بحث کو صرف "خدا" کے وجود اور عدم وجود میں کامیابی سے الجھا دیتے ہیں اور ذیل کے مشکل فلسفیانہ بحثیں شروع کر دیتے ہیں، مثلاً:

- علت و معلول اور علتِ اولیٰ
- واجب الوجود اور ممکن الوجود اور وجودِ مطلق
- سبب اور مسبب
- ازلیت و ابدیت وغیرہ وغیرہ

اس سب میں اصل مسئلے، یعنی مسلمانوں کے "مذہبی خدا (اللہ)" کے وجود یا عدم وجود پر تنقید ہی نہیں ہو پاتی جو کہ مسلم حضرات اور ہمارے مابین بحث و مباحثہ کا اصل موضوع ہونا چاہیے۔

کیا آپ کو پتا ہے کہ نجی محفلوں میں مسلمان مبلغین یہ ہدایات دیتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ ایکس مسلموں کو اس بحث میں الجھائے رکھو کہ کسی خدا کا وجود ہے یا نہیں، تاکہ وہ آگے بڑھ کر ہمارے مذہبی خدا "یعنی "اللہ" اور اس کے نظام (یعنی اسلام) پر تنقید نہ کر سکیں۔

چنانچہ مذہبی حضرات کے اس جال میں پھنسنے کی بجائے، اس 2 نکاتی مؤقف کو پیش کر کے بحث کو براہ راست "مذہبی خدا" تک لے جائیے۔

اصل مسئلہ: "وجہِ تخلیق" بمقابلہ "مقصدِ تخلیق"

جب ہم سوال پوچھتے ہیں کہ آخر پھر مسلمانوں کے مذہبی خدا (اللہ) نے کائنات اور انسان کی تخلیق کیوں کی، تو جواب میں مسلم علماء قرآن کا یہ دعویٰ پیش کر دیتے ہیں:

> **"میں (اللہ) نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا" (القرآن 51:56)۔**

ہمیں ان دو الگ مسائل کے فرق کو سمجھنا ہو گا جسے مذہبی اسکالرز یہاں خلط ملط کر رہے ہیں:

1. **تخلیق سے "قبل" کی وجہ (Motivation):** وہ کیا محرک یا ضرورت تھی جس نے ایک بے نیاز ہستی کو مجبور کیا کہ وہ کائنات جیسی عظیم الجثہ چیز اور انسان جیسی حقیر مخلوق پیدا کرے؟
2. **تخلیق کے "بعد" کا کام (Function):** یعنی پیدا ہونے کے بعد انسان کو کیا کرنا ہے (یعنی عبادت کرنا)۔

مسلم علماء جب یہ کہتے ہیں کہ "ہمیں عبادت اور آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا"، تو وہ دوسرے سوال کا جواب دے رہے ہوتے ہیں، جبکہ پہلا سوال (محرک کیا تھا؟) اب بھی تشنہ رہتا ہے۔

چنانچہ جب قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا، تو یہ دعویٰ دو وجوہات کی بنا پر درست نہیں:

- **محرک سے خالی جواب:** یہ جواب یہ تو بتاتا ہے کہ انسان نے بننے کے بعد کیا کرنا ہے، لیکن یہ نہیں بتاتا کہ اللہ کو یہ "عبادت کروانے" کی خواہش ہی کیوں پیدا ہوئی؟ اگر تخلیق سے پہلے کائنات نہیں تھی، تو کیا اللہ کو اپنی عبادت کی کمی محسوس ہو رہی تھی؟ اگر ہاں، تو وہ "بے نیاز" کیسا؟ اور اگر نہیں، تو پھر تخلیق کا عمل ایک لایعنی (Pointless) مشق بن جاتا ہے۔
- **نیز** یہ تصور کہ ایک کائنات کا خالق اپنی ہی تخلیق کردہ حقیر مخلوق سے اپنی تعریف اور بندگی کا مطالبہ کرے، بالکل غیر منطقی لگتا ہے۔

"الصمد" (بے نیازی) اور "عبادت" کا ٹکراؤ

قرآن کا ایک بڑا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ **الصمد** ہے (قرآن 112:2)، یعنی وہ "بے **نیاز**" ہے، اسے کسی کی **حاجت** نہیں۔

لیکن "عبادت کی خواہش" اس صفت کے براہِ راست خلاف جاتی ہے:

- جب کوئی ہستی یہ کہتی ہے کہ اسے عبادت کے لیے مخلوق چاہیے، تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر ایک "خواہش" یا "کمی" موجود تھی جسے پورا کرنے کے لیے اس نے تخلیق کا سہارا لیا۔ اگر اسے عبادت کی پرواہ نہ ہوتی، تو وہ انسان کو پیدا ہی نہ کرتا۔
- **نیز** تعریف، ستائش اور بندگی کی چاہت "انسانی کمزوریاں" ہیں۔ ایک طاقتور ہستی کو اپنی پہچان کروانے یا اپنی تعریف سننے کی کیا حاجت؟ یہ مطالبہ ثابت کرتا ہے کہ یہ خدا کا تصور دراصل انسانوں نے خود اپنی نفسیات کے مطابق گھڑا ہے، اسی لیے اس میں وہی انسانی انا (Ego) نظر آتی ہے جو ایک عام انسان میں ہوتی ہے۔

چنانچہ، اگر اللہ واقعی **الصمد** ہے، تو اسے نہ آزمائش کی ضرورت ہونی چاہیے تھی، نہ عبادت کی، اور نہ ہی اپنی موجودگی منوانے کی۔ ایک **مکمل** (Perfect) ہستی وہی ہوتی ہے جو ہر قسم کی خواہش اور عمل سے بے نیاز ہو۔ جیسے ہی اللہ نے "تخلیق" کا ارادہ کیا، اس نے ثابت کر دیا کہ وہ الصمد نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی پہچان یا عبادت کا محتاج تھا۔ یہ تضاد واضح کرتا ہے کہ آسمان پر کوئی ایسا مذہبی خدا موجود نہیں ہے، بلکہ یہ سب کہانیاں انسانی ساختہ ہیں۔

جب ہم "عبادت کی ضرورت" پر سوال اٹھاتے ہیں، تو مسلم علماء اس تضاد کو چھپانے کے لیے ایک نیا عذر پیش کرتے ہیں۔

> **"اللہ کو ہماری عبادت کی حاجت نہیں، بلکہ یہ تو ہمارے اپنے فائدے اور جنت تک رسائی کے لیے ہے تاکہ ہم اللہ کے قریب ہو سکیں اور جنت میں جا سکیں"۔**

یہ عذر درحقیقت سوال گندم جواب چنا کے مترادف ہے، کیونکہ یہ اصل سوال کو حل کرنے کے بجائے مزید الجھا دیتا ہے:

1. **بغیر ضرورت کے ارادہ کیوں؟** اگر اللہ کو عبادت کی ضرورت نہیں تھی، تو تخلیق سے **پہلے** وہ کیا محرک تھا جس نے اسے کائنات بنانے پر اکسایا؟ اگر اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی، تو وہ "خاموش" رہتا۔ **ایک ایکشن (تخلیق) ہمیشہ ایک محرک (Motivation) کا تقاضا کرتا ہے۔ محرک کے بغیر فعل "عبث" یا لایعنی ہوتا ہے،** اور ایک "حکیم" خدا عبث کام نہیں کر سکتا۔

2. **امتحان کی زبردستی کیوں؟** اگر عبادت کا فائدہ صرف ہمیں ملنا تھا، تو ہم سے ہماری رضامندی کے بغیر یہ "خطرناک امتحان" کا جوا کیوں کھیلا گیا؟ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص آپ کو زبردستی ایک آگ کے دریا میں پھینک دے اور کہے کہ "تیرا اسے پار کرنا تیرے اپنے فائدے کے لیے ہے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

چنانچہ قرآن کی آیت 51:56 اور مذہبی علماء کا موقف مل کر ایک مضحکہ خیز صورتحال پیدا کرتے ہیں۔

- یہ دعویٰ ایسے ہی غیر منطقی اور متضاد ہے، جیسے کہ اللہ کہے: **"میں کھا رہا ہوں، حالانکہ مجھے کھانے کی ضرورت نہیں ہے،"**
- یا پھر یہ ایسا ہے کہ اللہ کہے کہ: **"میں سو رہا ہوں، حالانکہ مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔"**

ایک باشعور انسان ایسے بیانات کو لازمی طور پر لایعنی قرار دے گا۔

نیز اللہ "متضاد" دعوے کر رہا ہے۔ قرآن میں ایک جگہ کہتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کو "عبادت" کے لیے پیدا کیا، تو دوسری جگہ کہتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کو جہنم کا پیٹ بھرنے کے لیے پیدا کیا۔

> ولقد ذرانا لجہنم کثیرا من الجن والانس (الاعراف: 179)
>
> ترجمہ:
>
> اور ہم نے دوزخ کے لیے کثیر تعداد میں جن اور انسان پیدا کیے ہیں۔

عجیب اللہ ہے کہ اب اسے جہنم کا پیٹ بھرنے کی بھی 'چاہت' پیدا ہو گئی۔

یہ عبادت والا خدائی دعویٰ اتنا عبث، اور عقل سے دور تھا کہ صرف غیر مسلم ہی اس کا انکار نہیں کرتے، بلکہ علامہ اقبال جیسے مسلمان "غیر شعوری" و "غیر ارادی" طور پر خود اللہ کی اس عبادت والے دعوے کی تکذیب کر بیٹھے اور کہنے لگے:

ے

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں (یعنی فرشتے)

غور فرمایئے:

ایک طرف اقبال اللہ کے عبادت والے قرآنی دعوے کی تکذیب کر رہے ہیں، مگر چونکہ خود مسلمان ہیں اس لیے پھر بھی اللہ کو ڈیفینڈ کرنے کے لیے "نیا عذر" پیش رہے ہیں کہ جنات و انسان کو اللہ نے "درد دل" کے واسطے پیدا کیا ہے۔

مگر اقبال کے اس نئے عذر کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اول تو اللہ کا کوئی "دل" ہی نہیں ہے جو اسے "دردِ دل" ہو۔ اور اگر کسی ہستی کے لیے مان لیا جائے کہ اسے دردِ دل ہو رہا تھا، اور اپنی اس اداسی کو مٹانے کے لیے اس نے جنات و انسانوں کو پیدا کیا، تو ایسی ہستی کبھی بھی اللہ نہیں ہو سکتی جو اداسی، تنہائی، دردِ دل جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو۔

یہ تمام تضادات ثابت کرتے ہیں کہ **"عبادت کا مقصد"** محض ایک انسانی ساختہ توجیہ ہے تا کہ ایک لایعنی تخلیق کو با معنی دکھایا جا سکے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انسان نے جب اللہ کا تصور تخلیق کیا، تو اسے ایک بادشاہ کی طرح "ستائش کا بھوکا" بنا دیا، لیکن جب عقل نے اس پر سوال اٹھائے، تو اسے "بے نیازی" کے پردوں میں چھپانے کی ناکام کوششیں شروع کر دی گئیں۔

اللہ کی حمد و تعریف کا امتحان کیوں؟

اگر امتحان کا مقصد صرف انسانیت کی خدمت، اخلاقی بلندی اور ظلم سے بچنا ہوتا، تو شاید عقل اسے کسی حد تک قبول کر لیتی۔ مگر اسلامی تصورِ خدا میں امتحان کا ایک بڑا حصہ اللہ کی اپنی ذات کی "تعریف و توصیف" اور "بندگی" پر مشتمل ہے۔ یہاں عقل یہ سوال کرنے پر مجبور ہے کہ کائنات کے خالق کو اپنی ہی مخلوق سے دن میں پانچ بار (اور مسلسل) اپنی تعریف کروانے کی کیا حاجت؟

اور یہ "عبادت اور تعریف کا سنڈروم" انسانوں سے آگے بڑھتا ہے:

فرشتوں کو دیکھیں کہ وہ تقریباً ہمیشہ سے ہی اللہ کی عبادت اور تعریف میں مشغول ہیں، باوجود اس کے کہ انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ملتا اور نہ ہی وہ اس کے بدلے جنت میں جائیں گے اور نہ ہی انہیں 72 حوریں ملیں گی۔ تو پھر اللہ ان سے مسلسل اپنی تعریفیں کیوں کروانا چاہتا ہے؟

جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے، تو روایتی جواب یہی ملتا ہے کہ "اللہ کو ان کی عبادت کی ضرورت نہیں"۔ لیکن یہ جواب منطقی طور پر "خود متصادم" (Self-contradictory) ہے۔

- اگر کسی فعل (Action) کی ضرورت نہ ہو، اور پھر بھی وہ فعل مسلسل انجام دیا جائے، تو اسے عقل کی زبان میں **"عبث"** یا **"فضول"** کام کہا جاتا ہے۔
- کیا ایک "علیم و حکیم" خدا لایعنی کاموں میں مصروف ہو سکتا ہے؟
- یہ کہنا کہ "میں تعریف کروا رہا ہوں مگر مجھے ضرورت نہیں"، بالکل ایسا ہی ہے جیسے اللہ کہے: **"میں کھانا کھا رہا ہوں، حالانکہ مجھے بھوک نہیں ہے"**، یا پھر اللہ کہے: **"میں سو رہا ہوں، حالانکہ مجھے نیند کی حاجت نہیں"**۔

اور یہ بات فرشتوں تک محدود نہیں ہے۔ اسلام کے مطابق تمام مخلوقات، جانوروں اور کیڑوں سے لے کر آسمانی اجسام جیسے چاند، سورج، اور ستاروں، پہاڑوں اور کائنات کا ہر ہر ذرہ اپنی پیدائش سے مسلسل اللہ کی عبادت اور

تعریف میں مصروف ہے، حالانکہ اس عبادت کا ان کو کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی جنت میں نہیں جائے گا اور نہ ہی انہیں 72 حوریں ملیں گی۔

کیا اللہ کا یہ اصرار کہ وہ ہمہ وقت اپنی عبادت و تعریف چاہتا ہے، اس کی **خود پسندی** narcissism کی علامت نہیں؟

یہ تمام صورتحال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ **اللہ نے انسان کو نہیں، بلکہ انسان نے اللہ کو اپنی تصویر پر تخلیق کیا ہے**، اور اس لیے اللہ میں بھی وہ تمام کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو کہ انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

اگر اللہ ازل سے ہے تو اس نے کائنات کو صرف 13.8 ارب سال پہلے ہی کیوں تخلیق کیا؟

اگر اللہ ازل (Infinity) سے موجود تھا، تو اس نے کائنات کی تخلیق کے لیے 13.8 ارب سال پہلے ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ ریاضیاتی طور پر، ازل کے مقابلے میں 14 ارب سال کی کوئی حیثیت نہیں۔

- کیا اللہ اس سے پہلے "لا تعلقی" کی حالت میں تھا؟
- کیا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اللہ ازلی طور پر تو موجود تھا لیکن کسی وجہ سے اسے صرف 13.8 ارب سال پہلے بے حد بوریت محسوس ہوئی؟ نتیجے کے طور پر، اس نے ایک کھیل تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا جس میں دو کردار ہوں: انسان اور شیطان، اور اب اللہ اپنی بوریت دور کرنے کے لیے ان کے ڈراموں میں لطف اندوز ہوتا ہے؟
- اگر تخلیق کا مقصد صرف عبادت یا امتحان تھا، تو اس ارادے کے لیے اربوں کھربوں سال تک انتظار کیوں کیا گیا؟ کیا خدا کے ارادے میں یہ تبدیلی کسی بیرونی اثر کے تحت آئی یا اس کی اپنی صفت میں کوئی کمی تھی؟

سائنس بتاتی ہے کہ زمین پر زندگی 3.5 ارب سال پرانی ہے، جبکہ انسان (Homo sapiens) صرف 3 لاکھ سال پہلے آئے۔

- **ڈائناسارز اور دیگر انواع:** انسان سے کروڑوں سال پہلے زمین پر دیو ہیکل مخلوقات راج کرتی تھیں۔ اگر کائنات کا مقصد صرف "انسان کی عبادت کا امتحان" ہے، تو ان کروڑوں سالوں کا کیا مقصد تھا جہاں انسان کا نام و نشان تک نہ تھا؟

- **تباہی کا مقصد:** 99٪ انواع جو کبھی زمین پر تھیں، اب معدوم ہو چکی ہیں۔ کیا اللہ ان انواع کو بنا کر "پریکٹس" کر رہا تھا؟ یا یہ محض ارتقائی عمل کے وہ اندھے موڑ ہیں جن کا کسی "انٹیلیجنٹ ڈیزائنر" سے کوئی تعلق نہیں؟

ملکی وے کہکشاں میں 200 سے 400 ارب ستارے ہیں، اور پوری کائنات میں ایسی اربوں کہکشائیں ہیں۔

- اگر مقصد صرف ایک سیارے (زمین) پر موجود انسانوں کا امتحان ہے، تو کھربوں میلوں پر پھیلی ہوئی کہکشائیں، بلیک ہولز اور سپر نووا بنانے کی کیا منطق ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک چیونٹی کے رہنے کے لیے پورا براعظم تعمیر کر دے۔ کیا اسے "انٹیلیجنٹ ڈیزائن" کہتے ہیں؟

انٹیلیجبٹ ڈیزائن دیکھنا ہے تو ایک موبائل فون کو دیکھیے جس میں کوئی ایک پرزہ بھی "فالتو" موجود نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ، حدیثوں کے مطابق، مہدی کا جلد آنا متوقع ہے تاکہ غیر مسلموں کے زیر اثر انسانوں کی حکمرانی کا خاتمہ ہو جائے۔ جب مہدی آئیں گے، تو وہ اس وسیع کائنات کو دریافت کرنے کی بجائے، زمین پر پر تشدد تنازعات میں ملوث ہوں گے اور آخر کار دنیا کا خاتمہ ہو گا۔ آسمان زمین پر گر جائیں گے اور ساری کائنات تباہ ہو جائے گی۔

قیامت کی بے شمار نشانیاں قرآن اور حدیث میں موجود ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی انسانوں کو چاند، سورج، یا دوسرے ستاروں تک پہنچنے کا ذکر نہیں کرتی۔

اگر خچر نما براق کو خلا میں پرواز کرنے کے لیے پروں کی ضرورت نہیں تھی، تو وہ زمین کی فضا میں بھی بغیر پروں کے پرواز کر سکتا تھا۔ مزید یہ کہ قرآن (آیت 35:1) میں آسمانوں میں فرشتوں کو 2، 3 یا 4 پروں کے ساتھ

پرواز کرتے ہوئے بتایا گیا ہے۔ چنانچہ سوال اپنی جگہ برقرار ہے اگر فرشتے خلا میں بغیر پر استعمال کیے اڑ سکتے ہیں تو پھر انہیں زمین کی فضا میں پر استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ان تمام دلائل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی دعووں میں کوئی **عقلی یا سائنسی تسلسل** نہیں ہے۔

1. کائنات کا وسیع ڈیزائن انسانوں کے "امتحان" والے چھوٹے مقصد سے میل نہیں کھاتا۔

2. مذہبی قصے (فرشتے، براق، قیامت) صرف زمینی مشاہدات اور انسانی تخیل تک محدود ہیں۔

3. "ازلی خدا" کا اچانک کائنات بنانا اور پھر اسے زمین کے چھوٹے سے تنازع (جنگوں) پر ختم کر دینا ایک لایعنی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت وہی سامنے آتی ہے کہ یہ کائنات کسی عادل یا بوریت کا شکار خدا کے بجائے طبیعیاتی قوانین کے تحت چل رہی ہے، جہاں انسان مرکزِ کائنات نہیں بلکہ ایک وسیع کائنات کا انتہائی چھوٹا اور اتفاقی حصہ ہے۔

کیڑے مکوڑوں کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا، جن کے پاس شعور ہی نہیں؟

ٹھیک ہے، انسانوں کے پاس شعور تھا، لیکن لاکھوں قسم کے کیڑے مکوڑوں کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا؟

چلیں، سائنس کی مخالفت میں اگر قرآن کہتا ہے کہ کیڑوں مکوڑوں میں بھی شعور ہے، تو قرآن کی یہ بات مان لیتے ہیں۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ نہ صرف انسانوں بلکہ چیونٹیوں کو بھی شعور حاصل ہے (حضرت سلیمان کی فوج کی کہانی)۔ لیکن پھر سوال اٹھ کھڑا ہو گا کہ اصولی طور پر، شعور حاصل کرنے کے بعد کیڑے مکوڑوں کو بھی پھر انسانوں اور جنات کی طرح جنت اور دوزخ میں تقسیم کیا جانا چاہیے تھا، اور جنت میں جانے والے کیڑے مکوڑوں کو بھی 72 حوریں ملنی چاہیے ہیں۔

اور کم از کم وہ سانپ جو حضرت ابو بکر کے ساتھ غار میں تھا، اسے تو لازماً دوزخ میں پھینک دینا چاہیے۔

مزید یہ کہ نیانڈر تھل، ڈینیسووان اور دیگر ہومینڈز کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا، جو تمام جدید انسانوں سے پہلے مر گئے؟ اس کا جواب دینا ناممکن ہے کیونکہ جب قرآن اور حضرت محمد صاحب کو نیانڈر تھل کا علم ہی نہیں تو بھلا پھر مسلمان اس کا جواب کیسے دے سکتے ہیں؟

جنت میں ہمیشہ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

مذہبی حضرات آپ کو ہر جگہ وہی پرانی بات دہراتے نظر آئیں گے کہ: "ہماری اس عارضی دنیاوی زندگی کا مقصد اگلی دائمی زندگی کی تیاری کرنا ہے، تاکہ یہ دیکھیں کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور جنت جاتا ہے اور کون ناکام ہو کر دوزخ میں چلا جاتا ہے۔"

عزیز مذہبی دوستو! کیا آپ نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے کہ آخر جنت میں ابدی زندگی کا مقصد کیا ہو گا؟

اس مختصر زندگی میں کھانا پینا، کپڑے پہننا زندگی انجوائے کرنا، آپ کے نزدیک مقصد نہیں بلکہ مادیت پسندی سمجھی جاتی ہے، اور آپ انہیں ترک کر دینے کا کہتے ہیں۔ لیکن آپ کے جنت میں جانے کا لالچ پھر یہی چیزیں بن جاتی ہیں اور آپ کو اس ابدی انجوائے منٹ کا مقصد بھی نہیں پتا۔

آپ پھر کیوں اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دے رہے ہیں؟

جنت کے جو تصورات (حوریں، شراب، گوشت، باغات) پیش کیے جاتے ہیں، وہ ساتویں صدی کے ایک صحرائی انسان کی خواہشات کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔

- آج کا انسان علم، دریافت، تخلیق اور کائنات کے اسرار جاننے میں دلچسپی رکھتا ہے۔
- کیا ایک ترقی یافتہ ذہن ابد تک صرف کھانے پینے اور جنسی لذتوں میں مصروف رہ کر خوش رہ سکتا ہے؟ یہ تصورِ جنت انسان کو ایک "حیوان" کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے جس کی تمام ضروریات صرف پیٹ اور جنسی جبلت تک محدود ہیں۔

اللہ کی لامتناہی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

ایک صاحب نے ایک یہ اہم سوال بھی اٹھایا:

> اگر آپ تھوڑی گہرائی سے سوچیں تو یہ سوال اٹھتا ہے: وہ خدا جو ہماری مختصر زندگی کے مقصد پر سوال اٹھاتا ہے، وہ خود ازل سے زندہ ہے اور ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ کیا اس خدا نے کبھی اپنی لامتناہی زندگی کا کوئی مقصد بیان کیا ہے؟ کیا اس خدا کی زندگی کا مقصد فقط ایک ایسی دنیا تخلیق کرنا تھا جہاں طاقتور ہمیشہ کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں؟ کیا اس خدا کی زندگی کا مقصد مسلسل اپنے ہی پیدا کردہ مخلوقات کو قحط، زلزلوں، طوفانوں اور سیلابوں کے ذریعے مارنا تھا؟ کیا اس خدا کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ دیکھ سکے کہ کون اس بے وقعت دنیا کے امتحان میں کامیاب ہوتا ہے اور کون جنت یا دوزخ میں جاتا ہے؟ کاش اس خدا نے ہماری مختصر زندگیوں کے مقصد کو طے کرنے سے پہلے اپنی لامتناہی زندگی کا مقصد واضح کیا ہوتا۔ (سید امجد حسین)

مسلم علماء کی دلیل: ہمارے والدین نے بھی ہمیں ہماری رضامندی کے بغیر پیدا کیا تھا

جب مسلم علماء یہ کہتے ہیں کہ "والدین نے بھی تو بغیر پوچھے پیدا کیا"، تو وہ دراصل ایک **غلط مماثلت** (False Analogy) پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

انسانی والدین اور اللہ میں ایک بڑا فرق ہے۔ انسانی والدین قدرتی قوتوں، سماجی دباؤ، اور ذاتی ضروریات کا شکار ہوتے ہیں۔ زندگی کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے وہ بچوں کو پیدا کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، یا بعض اوقات وہ بڑھاپے میں تنہائی کے خوف سے خاندان کے ذریعے اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر مسلمانوں کا تو ایمان ہے کہ اللہ "الصمد" ہے، یعنی وہ "بے نیاز" ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کسی چیز کی "خواہش" کرتا ہے تو یہ انحصار یا کمی کا اشارہ ہوگا، جو کہ "الصمد" ہونے کے تصور کے خلاف ہے۔ اس لیے انسانی والدین کے بچے پیدا کرنے کے پیچھے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے برعکس، اللہ کے کائنات اور انسانوں کو پیدا کرنے کی

وجہ / مقصد اب تک مکمل طور پر بے جواب ہے (نہ اللہ کی طرف سے، اور نہ ہی مسلمانوں کی طرف سے آج تک اس کا کوئی جواب پیش کیا جا سکا ہے)۔

یہ فرق مد نظر رکھتے ہوئے، انسانی والدین اور اللہ کے مقصدوں کا موازنہ درست نہیں ہے۔ جہاں انسانی والدین ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بچے پیدا کرتے ہیں، جبکہ مسلمانوں کے نزدیک ان کا اللہ ایسی کسی بھی ذاتی ضروریات سے بے نیاز ہے۔

مسلم علماء کا عذر: اللہ کو ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس نے ہمیں کیوں پیدا کیا

جب تمام عقلی دلائل ختم ہو جاتے ہیں، تو مذہبی بیانیہ اکثر اس پناہ گاہ میں چھپ جاتا ہے کہ "خدا کی حکمت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے"۔ لیکن یہ عذر درحقیقت ایک منطقی شکست کا اعتراف ہے:

اسلام کا پورا بیانیہ اس دعوت پر کھڑا ہے کہ "کیا تم غور نہیں کرتے؟" (افلا تعقلون)۔ اگر اللہ نے ہمیں پہچاننے کے لیے انسانی عقل ہی کو واحد پیمانہ قرار دیا ہے، تو پھر اسی عقل کے پیدا کردہ بنیادی سوالات سے یہ کہہ کر جان چھڑانا کہ "تمہاری عقل اسے سمجھ نہیں سکتی"، ایک **علمی خیانت** ہے۔

- اگر عقل اللہ کو پہچاننے کے لیے کافی ہے، تو وہ اس کے افعال کو سمجھنے کے لیے بھی کافی ہونی چاہیے۔
- اگر وہ افعال کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہے، تو پھر اس عقل کے ذریعے اللہ کو پہچاننے کا مطالبہ ہی غلط ہے۔

اللہ کی یہ "خاموشی" دراصل اس کے وجود پر سوالیہ نشان ہے۔

- اگر تخلیق کا خالق واقعی کلام کر رہا ہوتا، تو وہ تخلیق کا محرک (Motivation) ضرور بتاتا۔
- چونکہ قرآن اور احادیث میں اس کا کوئی عقلی جواب نہیں ملتا، اس سے یہ قیاس قوی ہو جاتا ہے کہ یہ کلام کسی مافوق الفطرت ہستی کا نہیں بلکہ ساتویں صدی کے ایک انسان (محمد) کا تھا، جو اپنے محدود انسانی علم کی وجہ سے ان کائناتی اور وجودی سوالات (Existential Questions) کا جواب دینے سے قاصر تھے۔

مذہبی بیانیہ ایک طرف تو اللہ کو "واضح" (المبین) کہتا ہے، مگر جب ثبوت اور منطق کی باری آتی ہے تو اسے "پراسرار" بنا دیتا ہے۔

- اگر اللہ کے پاس اپنے دعوؤں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں، تو پھر وہ ہندومت کے برہما، یونانیوں کے زیوس یا عیسائیوں کے تثلیث کے تصور سے مختلف کیسے ہوا؟
- جب ہر مذہب کا خدا اپنے وجود کی دلیل دینے کے بجائے "ایمانِ غیب" (بغیر دیکھے ماننے) کا مطالبہ کرتا ہے، تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام تصورات انسانی خوف اور لاعلمی کی پیداوار ہیں، نہ کہ کسی عالمگیر سچائی کی۔

اس ثبوت کی کمی تمام کے تمام خداؤں کے دعووں کو یکساں مشتبہ اور ناقابل تصدیق بنا دیتی ہے۔

آخر امتحان کیوں؟

عام طور پر جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ تخلیقِ انسانی کا مقصد کیا ہے، تو اسلام کے علمبر داروں کی جانب سے ایک روایتی جواب سامنے آتا ہے:

"اللہ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا تا کہ وہ اس دنیا میں اس کا "امتحان" لے سکے۔"

لیکن یہ جواب اس بنیادی اور منطقی سوال کا احاطہ کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ خود "امتحان" لینے کا محرک کیا تھا؟ اگر اللہ کے ذہن میں امتحان لینے کی خواہش یا ارادہ پیدا نہ ہوتا، تو اسے سرے سے کائنات اور انسان کی تخلیق کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ "امتحان" کا تصور ان افعال سے متعلق ہے جو انسان کو "پیدا ہونے کے بعد" انجام دینے ہیں۔ لہٰذا، امتحان کو تخلیق کی "وجہِ جواز" (Justification) کے طور پر پیش کرنا منطقی مغالطہ ہے۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ امتحان میں کیا کرنا ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ امتحان لینے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟

اسلام کا دفاع کرنے والوں کو بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ:

1. اللہ نے اس اصل محرک کی وضاحت نہیں کی کہ اسے ایک ایسی آزمائش شروع کرنے کی چاہت کیوں ہوئی جس کا نتیجہ پہلے سے اس کے علم میں تھا۔

2. نہ ہی اس نے یہ بتایا کہ وہ اس محرک کو انسانوں پر ظاہر کرنے سے کیوں قاصر رہا۔

اس منطقی خلا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آسمان پر کوئی ایسا مذہبی خدا (جیسا کہ مسلمانوں کا تصورِ اللہ ہے) موجود ہی نہیں ہے جو اس خواہش اور محرک کی کوئی معقول وجہ بیان کر سکے جس کے لیے اسے اس عظیم الشان تخلیقی عمل کی ضرورت پڑی۔

جب روایتی جوابات ناکام ہو جاتے ہیں، تو مسلم علماء نت نئے عذرات پیش کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً:

- یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اللہ اس بات کا پابند نہیں ہے کہ وہ اپنی "حقیر مخلوق" کو یہ بتائے کہ اس نے ان کی آزمائش کا فیصلہ کیوں کیا۔
- یا یہ عذر تراشا جاتا ہے کہ اگر وہ وجہ بتا بھی دے، تو انسانی عقل اسے سمجھنے کی سکت نہیں رکھتی۔

یہ دونوں عذرات دراصل اس بنیادی سوال سے فرار کی کوششیں ہیں جو مذہب کے پورے ڈھانچے کو منطقی طور پر کمزور کر دیتے ہیں۔

اللہ کو امتحان میں اپنی عبادت اور تعریفوں کے پُل بندھوانے کی ضرورت کیوں؟

اگر امتحان میں انسانیت کی مدد کرنا، اچھے کام کرنا، اور برائیوں سے بچنا شامل ہوتا تو شاید بات سمجھ میں آتی۔

لیکن دن میں پانچ بار اللہ کی عبادت کے نام پر اس کی تعریفوں کے پُل باندھنے کا امتحان کیوں؟

اور یہ "عبادت اور تعریف" کا مطالبہ صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ فرشتوں پر غور کریں کہ وہ تقریباً ہمیشہ سے اللہ کی عبادت اور تعریف میں مصروف ہیں، حالانکہ انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نہ ہی انہیں جنت میں جانا ہے اور نہ ہی 72 حوروں سے لطف اندوز ہونا ہے۔

تو پھر اللہ ان سے مسلسل عبادت اور تعریف کا مطالبہ کیوں کرتا ہے؟

ہاں، اسلام پسند وہی کمزور دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ اللہ کو فرشتوں کی عبادت اور تعریف کی ضرورت نہیں، لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے **اللہ مسلسل کھانا کھاتا جائے اور ساتھ میں یہ بھی کہتا جائے کہ مجھے کھانے کی ضرورت نہیں**، یا اگر اللہ کہے: "**میں سو رہا ہوں، حالانکہ مجھے سونے کی ضرورت نہیں۔**"

لیکن یہ فرشتوں تک محدود نہیں ہے۔ اسلام کے مطابق، تمام مخلوقات، چرند پرند اور کیڑے مکوڑوں سے لے کر چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، اور کائنات کا ہر ذرہ ہر ہر لحظہ اللہ کی عبادت اور تعریف میں مصروف ہے، حالانکہ یہ عبادت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

کیا اللہ کا 24 گھنٹے اپنی تعریف اور عبادت پر اصرار **خود پسندی** کی علامت نہیں ہے؟

کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان نے اللہ کو تخلیق کیا ہے، اسی لیے اللہ میں بھی وہی انسانی کمزوریاں پائی جاتی ہیں؟

اللہ کا امتحان: عدلِ الٰہی یا انسانیت کے خلاف بدترین ظلم؟

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ اسلام کے پیش کردہ خدا کا کوئی وجود ہے، تو اس کا ترتیب دیا گیا یہ "امتحان" انسانیت کے خلاف سب سے بڑی ناانصافی اور ظلم کے طور پر سامنے آتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ وہ **"مذہبی جبر"** ہے جس میں انسان پیدا ہوتا ہے۔ ہم ایک سادہ لوح انسان کے طور پر جنم لیتے ہیں، لیکن ہمارا خاندانی اور سماجی ماحول ہمارے عقیدے کا تعین کر دیتا ہے۔ اعداد و شمار گواہ ہیں کہ عیسائی گھرانوں میں پیدا ہونے والے 99.999٪ بچے عیسائی رہتے ہیں اور ہندوؤں کے بچے ہندو ہی رہتے ہیں۔
مواصلات کے اس جدید دور میں بھی، کسی دوسرے مذہب سے اسلام کی طرف منتقلی کی شرح شاید 0.0001٪ بھی نہیں ہے۔

اب یہاں ایک سنگین منطقی اور اخلاقی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ ہی انسانوں کو مختلف غیر مسلم خاندانوں میں پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، تو اس کے اپنے **"ڈیزائن"** کے مطابق اربوں انسان محض اپنے جائے پیدائش کی وجہ سے پیدائشی طور پر ہی جہنم کی آگ میں ابدی طور پر دھکیلے جانے کے نامزد ہو چکے ہیں۔ کیا یہ واقعی وہ "انصاف" ہے جس کا دعویٰ مذہب کرتا ہے؟

ہمارا اخلاقی شعور ہمیں بتاتا ہے کہ یہ کائنات کا سب سے بڑا ظلم ہے کہ اربوں انسانوں کو، ان کے تمام تر حسنِ سلوک اور انسانیت کے باوجود، صرف اس لیے ابدی جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے کہ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جہاں اسلام نہیں تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم کو ایسے پرچے میں فیل کر کے سزا دی جائے جو اسے کبھی پڑھایا ہی نہیں گیا۔

تاریخ کے ظالم ترین انسانوں کے مظالم بھی اس الٰہی سزا کے سامنے ہیچ ہیں، کیونکہ انسانی مظالم محدود وقت کے لیے ہوتے ہیں، جبکہ اللہ کا یہ مبینہ ظلم "ابدی" ہے۔ ایک ایسا مذہب جو انسانیت کے اتنے بڑے حصے کو بلا قصور مجرم قرار دے کر ایسی اذیت ناک سزا دے، وہ انسانیت کا ہمدرد کیسے ہو سکتا ہے؟

اسلامی خدا کبھی براہِ راست انسان کے سامنے ظاہر نہیں ہوا، نہ کسی فرشتے نے سرِ عام حق کی گواہی دی، اور نہ ہی کوئی ایسا معجزہ دکھایا گیا جو سائنسی طور پر ناقابلِ تردید ہو۔ اس کے باوجود مطالبہ یہ ہے کہ ہم محض چند قدیم روایات اور تعلیمات کو دیکھ کر اسے "عادل" مان لیں۔ لیکن جب ہم ان تعلیمات کا معروضی تجزیہ کرتے ہیں، تو ہمیں وہاں عدل کے بجائے ناانصافی اور عقل کے بجائے جبر و ظلم کی انتہا دکھائی دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: **کیا ایک غیر عادل ہستی خدا کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟**

مسلم علماء کی دلیل: امتحان جائز ہے کیونکہ ہر کسی نے اسلام کے بارے میں سنا ہے اور انہیں اسلام قبول کرنے کا موقع ملا ہے

مذہبی مبلغین اکثر یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا، کیونکہ آج کے دور میں اسلام کا پیغام پوری دنیا میں پہنچ چکا ہے اور ہر غیر مسلم کے پاس اسے قبول کرنے کا "برابر موقع" موجود ہے۔

ہم اس دعوے کو چند ٹھوس وجوہات کی بنا پر مسترد کرتے ہیں:

اوّل یہ کہ اگر 99.999% غیر مسلم اپنے خاندان کے مذہب پر ہی قائم رہتے ہیں، تو یہ محض اتفاق نہیں بلکہ انسانی نفسیات اور سماجی جبر کا منطقی نتیجہ ہے۔ کسی مذہب کے بارے میں محض "سن لینا" اسے قبول کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے برسوں کی تحقیق اور اپنے موروثی عقائد سے مکمل بغاوت درکار ہوتی ہے۔

یہاں مبلغین کا ایک سنگین **دوہرا معیار (Double Standard)** سامنے آتا ہے۔ جب کوئی مسلمان اسلام چھوڑنا چاہے (Ex-Muslim)، تو اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے اسلام میں "پی ایچ ڈی" کی ڈگری لے، تمام باریکیوں کو سمجھے اور پھر اسلام چھوڑنے کا فیصلہ کرے۔ لیکن جب کسی غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے، تو اس کے لیے کسی تحقیق یا علم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی؛ بس اس کا اسلام کے نام کا "**سن لینا**" ہی اس کی ابدی سزا کا جواز بن جاتا ہے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟

اس ناانصافی کو سمجھنے کے لیے محمد صاحب کی اپنی والدہ کی مثال ہی کافی ہے، جن کے بارے میں صحیح مسلم (حدیث: 976b) میں درج ہے کہ اللہ نے انہیں اپنی والدہ کی بخشش کی دعا مانگنے سے روک دیا، کیونکہ وہ "غیر مسلم" فوت ہوئیں اور وہ ابدی جہنم کا ایندھن ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "دورِ جاہلیت" کی اس خاتون کے پاس سچا مذہب ڈھونڈنے کا کیا موقع تھا؟

عرب میں دین حنیف کے صرف چار پیروکار تھے۔ ان میں سے بھی دو نے بعد میں دین حنیف کو ترک کر دیا اور وہ مرتد بن گئے۔ محمد کی والدہ کا شاید ان چاروں میں سے کسی ایک سے بھی براہ راست سامنا نہیں ہوا ہو گا۔

اب ایک ایسی عورت جو قبیلے کے سخت روایتی ڈھانچے میں مقید ہو، جہاں نہ کوئی انٹرنیٹ تھا، نہ عالمی مواصلات، اور جہاں زندگی کی تگ و دو صرف جسمانی بقا کے گرد گھومتی ہو، وہ کیسے ایک فلسفی کی طرح بیٹھ کر مذاہب کا موازنہ کرتی؟

کسی شخص کے لیے اپنے بچپن کے عقیدے، خاندان کی روایت اور معاشرتی دباؤ کو توڑنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، خاص طور پر ایک ایسی عورت کے لیے جو سماجی طور پر دوسروں پر منحصر ہو۔

کیا محمد کی والدہ کو وہی مواقع حاصل تھے جو آج ایک مسلم خاندان میں پیدا ہونے والے شخص کو حاصل ہیں؟ اگر جواب "نہیں" ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو یہ اس بات کا صریح اعتراف ہے کہ اللہ کا یہ نام نہاد "امتحان" سرے سے غیر عادلانہ ہے

یہ حقیقت اس دعوے کی دھجیاں اڑا دیتی ہے کہ اللہ انصاف کرنے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے "ڈیزائن" کے مطابق اربوں انسان محض اپنی جائے پیدائش اور حالات کی بنا پر جہنم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

مسلم علماء کی دلیل: امتحان جائز ہے کیونکہ کائنات کی تخلیق اللہ کے وجود کا ثبوت ہے

اسلام پسندوں کی جانب سے ایک اور مقبول دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کے وجود کی گواہی دیتا ہے۔ وہ قرآن کی اس آیت کا سہارا لیتے ہیں:

"بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں... عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں" (3:190)۔

ان کا دعویٰ ہے کہ غیر مسلم خاندان میں پیدا ہونا کوئی رکاوٹ نہیں، کیونکہ انسان کائنات کے نظام کو دیکھ کر اسلام کے خدا (اللہ) کو پہچان سکتا ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ سوائے ایک منطقی مغالطہ کے اور کچھ نہیں۔ ہم اس دلیل کو درج ذیل بنیادوں پر مسترد کرتے ہیں:

1. کائنات کی تخلیق کا دعویٰ صرف اسلام تک محدود نہیں ہے۔ ہندومت، عیسائیت، یہودیت اور دیگر قدیم مذاہب کے مقدس متون بھی اپنے اپنے دیوتاؤں کو کائنات کا خالق قرار دیتے ہیں۔ ایک عام انسان کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ ان سینکڑوں دعوے داروں میں سے سچا خالق کون ہے۔ کائنات کا مشاہدہ شاید آپ کو "کسی قوت" کے تصور تک تو لے جائے، لیکن وہ یہ ہرگز نہیں بتاتا کہ وہ قوت "اللہ" ہے، "وشنو" ہے یا کوئی اور۔ لہٰذا، یہ دلیل کسی مخصوص "مذہبی خدا" کو ثابت کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہے۔

2. مذہبی مبلغین جس تخلیق کو نشانی قرار دیتے ہیں، جدید سائنس اس کے بارے میں بالکل مختلف اور تجرباتی حقائق پیش کرتی ہے۔ اسلام سمیت تمام مذاہب نے کائنات کی تخلیق اور انسانی ارتقاء کے حوالے سے جو کہانیاں بیان کی ہیں، وہ جدید فلکیات (Astronomy) اور حیاتیات (Biology) کے مسلمہ اصولوں کے سامنے محض افسانے ثابت ہوئے ہیں۔ جب بنیاد ہی سائنسی طور پر غلط ہو، تو اسے سچائی کی دلیل کیسے مانا جا سکتا ہے؟

3. تجرباتی اعداد و شمار (Empirical Data) سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ اگر کائنات کو دیکھ کر اللہ کو پہچاننا اتنا ہی فطری اور آسان ہوتا، تو غیر مسلم خاندانوں میں پیدا ہونے والے 99.999٪ لوگ اسے دیکھ کر مسلمان ہو جاتے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یا تو یہ "نشانیاں" اتنی واضح نہیں ہیں، یا پھر انسان کی سماجی کنڈیشننگ (Social Conditioning) ان نشانیوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

چنانچہ یہاں نتیجہ یہی نکل رہا ہے اگر اللہ نے اس مبہم اور مشترکہ دلیل کی بنیاد پر اربوں انسانوں کی نجات کا فیصلہ کرنا ہے، تو یہ انصاف کے کسی بھی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ ایک ایسی پہیلی بوجھنے کا مطالبہ کرنا جس کے جوابات ہر مذہب میں مختلف ہوں، اور صحیح جواب نہ ملنے پر ابدی جہنم کی سزا دینا، صریحاً ظلم ہے۔

کم سن غیر مسلم بچے اور ابدی جہنم۔۔۔ یہ عدل کا خون نہیں تو اور کیا ہے؟

کیا کسی مذہبی مبلغ میں اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت ہے کہ ان معصوم بچوں کا کیا انجام ہو گا جو غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے اور ابھی بلوغت کی دہلیز پر ہی تھے کہ موت کا شکار ہو گئے؟

اسلامی فقہ کے مطابق، ایک لڑکی نو سال کی عمر میں اور ایک لڑکا بارہ سال کی عمر میں "بالغ" تصور کیے جا سکتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ اب وہ اپنے عقیدے کے خود ذمہ دار ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نو یا بارہ سال کا ایک بچہ اس ذہنی سطح پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے موروثی مذہب، خاندانی روایات اور صدیوں پر محیط سماجی دباؤ کو محض "اسلام کا نام" سن کر رد کر دے؟

دنیا کے غیر مسلم خطوں میں رہنے والے کروڑوں بچے، جنہیں ابھی کائنات اور خود اپنی زندگی کے بارے میں بنیادی فہم بھی حاصل نہیں ہوتا، وہ اللہ کے اس نام نہاد "امتحان" کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اسلام قبول کیے بغیر مر جائیں، تو روایتی مذہبی تصور کے مطابق وہ ابدی جہنم کے ایندھن کے سوا کچھ نہیں۔

کیا یہ کسی بھی لحاظ سے "خدائی انصاف" کہلا سکتا ہے؟

1. ایک طرف وہ بچہ ہے جو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا، اسے ورثے میں اسلام ملا اور وہ بغیر کسی جدوجہد کے "نجات" کا حقدار ٹھہرا۔

2. دوسری طرف وہ معصوم بچہ ہے جو غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوا اور اسے محض اس کے جائے پیدائش اور کم عمری کی بنا پر ابدی آگ کا سزاوار ٹھہرا دیا گیا۔

ہمارے اندر موجود انسانیت پکار پکار کر ہماری رہنمائی کر رہی ہے کہ معصوم بچوں کو ان کے جغرافیائی حالات کی سزا دینا کائنات کا بدترین ظلم ہے۔ ایک ایسی ہستی جو اتنی بے حس ہو کہ وہ نو سالہ بچی یا بارہ سالہ بچے سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ ایک فلسفی کی طرح حق اور باطل کا فرق پہچان لے، اور ناکامی پر اسے ابدی عذاب میں جھونک دے، وہ ہستی کم از کم "رحیم و عادل" نہیں ہو سکتی۔

یہ وہ سنگین تضاد ہے جو مذہب کے "انصاف" والے پورے لبادے کو چاک کر دیتا ہے۔ اگر نجات کا معیار صرف "مسلم گھرانے میں پیدا ہونا" ہے، تو پھر امتحان کا پورا ڈھونگ محض ایک بے معنی اور ظالمانہ مشق کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

محمد صاحب نے یہ دعویٰ کیوں شروع کیا کہ تمام غیر مسلم جہنم کی آگ کا ایندھن ہیں؟

یہ سوال نہایت بنیادی ہے کہ آخر محمد صاحب نے یہ دعویٰ کیوں شروع کیا کہ تمام غیر مسلم، ان کے اعمال سے قطع نظر، ابدی جہنم کی آگ کا ایندھن بنیں گے؟ اس کے پیچھے کوئی آفاقی عدل نہیں، بلکہ اس دور کے مخصوص سیاسی اور عسکری حالات کار فرما تھے۔

1. مدینہ کے ابتدائی دور میں جب محمد صاحب کو یہودیوں اور مقامی قبائل کے تعاون کی ضرورت تھی، تو قرآن کا لہجہ مفاہمانہ تھا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

> "یقین جانو کہ جو کوئی مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں یا صابیوں میں سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے..." (قرآن 2:62)

یہاں نجات کا معیار صرف "نیک عمل" تھا، نہ کہ محمد صاحب کی نبوت پر ایمان لانا۔ لیکن جیسے ہی اقتدار مضبوط ہوا اور مکہ کے قریش کے خلاف جنگوں کا آغاز ہوا، یہ آیت عملاً منسوخ کر دی گئی۔ اب نیا حکم یہ آیا کہ محمد صاحب کی نبوت کا انکار کرنے والے کے تمام نیک اعمال ضائع (حبطِ اعمال) ہو جائیں گے اور اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہو گا۔

2. مکہ کے خلاف جنگ کے دوران ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ صحابہ اپنے ہی رشتہ داروں، بھائیوں اور والدین کے خلاف تلوار اٹھانے سے ہچکچا رہے تھے۔ اس انسانی جذباتی رکاوٹ کو توڑنے کے لیے "نفرت کا بیج" بونا ضروری تھا۔

چنانچہ محمد صاحب نے یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ ان کی اپنی والدہ، والد، چچا (ابو طالب) اور دادا (عبد المطلب) بھی جہنم میں ہیں۔ جب صحابہ نے دیکھا کہ خود محمد صاحب کے قریبی ترین خون کے رشتے جہنمی قرار دیے جا چکے ہیں، تو ان کے دلوں میں اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے لیے ہمدردی ختم ہو گئی اور وہ اپنے پیاروں کے خلاف لڑنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔

3. یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ "امتحان" اور "ابدی جہنم" کا تصور دراصل ایک جنگی حکمتِ عملی (War Strategy) کے طور پر ابھرا۔ اس کا مقصد:

- مخالفین کے دلوں میں خوف پیدا کرنا تھا۔
- پیروانِ اسلام کو اپنے معاشرے سے کاٹ کر مکمل طور پر اپنی قیادت کے تابع کرنا تھا۔
- انسانی ہمدردی کے جذبوں کو مذہبی جنونیت کے ذریعے دبانا تھا۔

یہاں سے یہی نتیجہ نکل رہا ہے کہ جسے "خدائی امتحان" کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک سیاسی ضرورت تھی تاکہ ایک ایسی فوج تیار کی جا سکے جو اپنے ہی خاندان کے خلاف لڑنے میں عار محسوس نہ کرے۔ اگر نجات کا معیار صرف "انسانیت اور اچھے اعمال" ہوتا، تو پھر کسی کو اپنے غیر مسلم باپ یا بھائی پر تلوار اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

ان معذور بچوں کا کیا جو انتہائی درد و تکلیف میں زندگی گذارتے ہیں؟

یہ مسئلہ اس وقت اخلاقی اور عقلی طور پر انتہائی سنگین صورت اختیار کر جاتا ہے جب ہم ان بچوں کے بارے میں سوچتے ہیں جو پیدائشی طور پر شدید ذہنی و جسمانی معذوری یا ایسی مہلک بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں جن کا انجام صرف درد اور موت ہے۔

ان بچوں کو ان کی رضامندی کے بغیر ایک ایسی زندگی میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں سانس لینے سے لے کر حرکت کرنے تک ہر عمل ایک اذیت بن جاتا ہے۔ وہ اپنی مختصر سی زندگی اسی کرب میں گزار کر بچپن ہی میں فوت ہو جاتے ہیں۔ یہاں عقل سوال کرتی ہے کہ: **ان معصوموں کا جرم کیا تھا؟ اور اس لایعنی تکلیف سے کائنات کو کون سا اخلاقی سبق مل رہا تھا؟**

مذہبی حلقے عموماً اس ہولناک منظر کی پردہ پوشی کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ بچہ والدین کے لیے "آزمائش" ہے، اور انعام کے طور پر یہ بچہ خود بھی جنت میں جائے گا اور اپنے والدین کی بخشش کا ذریعہ بھی بنے گا (شفاعت کے ذریعے)۔ بظاہر خوبصورت نظر آنے والی یہ وضاحت درحقیقت اسلامی الٰہیات (Theology) کے اپنے ہی اصولوں سے متصادم ہے:

1. **نیت کا فقدان:** اسلام کا بنیادی اصول ہے کہ **"اعمال کا دارومدار نیت پر ہے" (انما الاعمال بالنیات)**۔ جزا اور سزا کا پورا تصور انسان کے اپنے آزادانہ انتخاب اور ارادے (Free Will) سے جڑا ہے۔ ایک معذور بچہ، جو ذہنی طور پر فیصلے کے قابل ہی نہیں، اس نے نہ تو پیدا ہونے کا انتخاب کیا، نہ اس اذیت پر رضامندی دی اور نہ ہی کسی "آزمائش" کو قبول کرنے کی نیت کی۔ جب عمل میں اس کی اپنی نیت شامل ہی نہیں، تو اسے "انعام" کے طور پر جنت دینا اخلاقی طور پر ویسا ہی لایعنی ہے جیسے کسی کو بلاوجہ سزا دینا۔

2. **والدین کو جنت کیوں؟:** اگر والدین صرف اس لیے جنت کے حقدار بن جاتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں ایک معذور بچہ پیدا ہوا، تو یہاں بھی "نیت" کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ والدین نے معذور بچہ پیدا کرنے کی "نیت" نہیں کی تھی، بلکہ یہ صورتحال ان پر زبردستی مسلط کی گئی۔ کیا کسی مجبور اور غیر اختیاری صورتحال پر ابدی انعام دینا انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟

3. **انسان بطور Tool:** اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بچے کو تکلیف صرف اس لیے دی گئی تا کہ اس کے ذریعے دوسروں (والدین) کا امتحان لیا جا سکے، تو یہ الٰہی انصاف پر سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بچہ ایک آزاد انسان نہیں بلکہ محض ایک "آلہ" یا "ٹشو پیپر" تھا جسے کسی دوسرے کی روحانی ترقی کے لیے قربان کر دیا گیا۔ کیا ایک رحیم و عادل خدا کسی معصوم کو دوسرے کے امتحان کے لیے ایندھن بنانا جائز سمجھتا ہے؟

ایک "Post-hoc" بہانہ:

حقیقت یہ ہے کہ معذور بچوں کے لیے "جنت کا سبز باغ" دکھانا دراصل ایک Post-hoc بہانہ ہے (یعنی واقعہ گزر جانے کے بعد اسے درست ثابت کرنے کے لیے گھڑا گیا عذر)۔ چونکہ مذہبی ذہن اس دنیا میں موجود بنیادی ناانصافی اور تکلیف کی کوئی عقلی وجہ بیان نہیں کر پاتا، اس لیے وہ مستقبل کی ایک فرضی جنت کا سہارا لیتا ہے تا کہ موجودہ ظلم کو "انصاف" کا نام دیا جا سکے۔

یہ معذور بچے اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ کائنات کا نظام کسی "انٹیلیجنٹ ڈیزائن" یا "عادل خدا" کے بجائے فقط ایک اندھے حیاتیاتی اتفاقات اور ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ کائنات کسی انصاف کے اصولوں پر نہیں چل رہی ہے اور یہاں انصاف آسمان سے نہیں اترتا بلکہ انسانوں کو خود اپنی عقل اور ہمدردی سے تخلیق کرنا پڑتا ہے۔

محمد صاحب کا دعویٰ: امتحان جائز ہے کیونکہ تمام انسانوں نے اپنی پیدائش سے قبل اللہ کے رب ہونے کی گواہی دی تھی

بہت سے لوگ محمد صاحب سے ناخوش تھے کہ وہ ان کے والدین کو ابدی جہنم کا ایندھن کیوں قرار دے رہے ہیں جبکہ ان کے والدین کیسے اللہ کو پہچاننے کا امتحان پاس سکتے تھے جبکہ وہ محمد صاحب کی آمد سے قبل ہی مر چکے تھے۔

بہر حال، محمد صاحب نے امتحان کو درست ثابت کرنے کے لیے درج ذیل دعویٰ کر دیا۔

قرآن 7:172 : یاد کرو جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی اور انہیں خود ان پر گواہ کیا، کیا میں تمہارا رب نہیں سب بولے کیوں نہیں ہم گواہ ہوئے کہ **کہیں قیامت کے دن کہو کہ ہمیں اس کی خبر نہ تھی.**

جواباً عرض ہے کہ اول تو یہ کہ یہ سرے سے کوئی ثبوت ہی نہیں ہے بلکہ صرف قرآن (یعنی محمد صاحب) کا دعویٰ ہے۔ کوئی بھی اس کی تصدیق کرنے پر قادر نہیں کہ آیا کوئی اللہ موجود ہے، اور کسی نے انہیں آدم کی کمر سے (ان کی پیدائش سے پہلے) نکالا تھا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ ان کا رب ہے۔

ایسا دعویٰ تو ہر مذہب کا ماننے والا کر سکتا ہے کہ ان کے خدا نے ان کی پیدائش سے قبل انہیں زندہ کر کے ان سے ایسا کوئی وعدہ لیا تھا۔

چنانچہ یہ فقط ایک **دعوی** ہے، **ثبوت** نہیں۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ **"جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا۔"** کوئی بھی شخص اٹھ کر اپنے مذہب کے متعلق ایسے دعوے کر سکتا ہے کہ آسمانوں میں اس کے خدا نے پیدائش سے قبل ایسے وعدے لیے تھے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ بغیر کسی ثبوت کے، صرف اس دعوے کی بنیاد پر کیسے ایسے شخص یا اس کے مذہب پر ایمان لایا جا سکتا ہے؟

دوسری بات یہ کہ یہ آیت دعویٰ کرتی ہے کہ:

- **اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں سے ان کی پیدائش سے پہلے** (اسے رب ماننے اور اس کی عبادت کرنے کا) وعدہ لیا ۔
- پھر جب وہ **اس دنیا میں** بھیجے گئے تو انہیں انکا یہ وعدہ **بھلا دیا** گیا۔
- اور پھر انہیں یہ وعدہ دوبارہ یاد دلایا جائے گا، **صرف ان کی موت کے بعد (قیامت کے دن)** ۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ جو کچھ پیدائش سے **پہلے** ہوا، یا جو کچھ مرنے کے **بعد** ہو گا، **اللہ اس کی بنیاد پر اس دنیا میں انکا امتحان کیوں لے رہا ہے** ؟

یہ امتحان صرف اس صورت میں بن پاتا جب اسی دنیا میں اللہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتا، اور صرف اس کے بعد انہیں امتحان میں ڈالتا، اور جو لوگ پھر بھی **جان بوجھ** کر اس کی نافرمانی کرتے اور اسے خدا تسلیم نہ کرتے، تو اس نافرمانی کے نتیجے میں انہیں ہمیشہ کہ آگ میں ڈالا جاتا۔

مثال کے طور پر، اسلامی کہانی کے مطابق، اللہ ابلیس پر ظاہر ہوا، اور ابلیس کو یہ بات **بھلائی** نہیں گئی، لیکن پھر بھی اس نے **جان بوجھ** کر اللہ کی نافرمانی کی۔ ایسی صورت میں سمجھ میں آتا ہے کہ ابلیس کو جہنم میں کیوں ڈالا جائے گا۔

لیکن انسانوں کا معاملہ ابلیس سے بالکل مختلف ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں ہے:

- ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اللہ ان کے سامنے کبھی بھی کھلم کھلا ظاہر نہیں ہوا جیسا کہ اس نے ابلیس کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح، اپنے خاندانوں کے زیر اثر، ان میں سے 99.9999٪ لوگوں نے کبھی اللہ کو قبول نہیں کیا اور غیر مسلم ہی رہے۔
- لاکھوں غیر مسلم سچائی کے ساتھ حقیقی خدا کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اسلام میں ایسی بہت سی مسائل، متنازعہ، اور انسانیت مخالف تعلیمات ہیں کہ انہیں اپنے **نیک ارادوں** کی وجہ سے اسلام سے انکار کرنا پڑا۔

ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، لاکھوں ایکس مسلمز ہیں جو اسلام پر پختہ یقین رکھتے تھے اور اس پر عمل پیرا تھا۔ لیکن انہیں پھر اسلام میں جھول نظر آیا، اور انہوں نے انسانیت کا درد بھی محسوس کیا۔ جب انہوں نے سچے دل سے خدا کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو ان کی تلاش نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ آسمانوں پر کوئی اللہ نہیں ہے اور محمد صاحب اپنے طور پر یہ مذہب بنا رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسلام کو ترک کر دیا۔

اسلام کا دعویٰ ہے:

> إنما الأعمال **بالنيات**
> (بے شک اعمال کا دارومدار **نیتوں** پر ہے)

لیکن یہاں ہم ایک واضح تضاد دیکھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کی حقیقی نیت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے، انہیں مرتد کہا جاتا ہے۔ اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ انہیں نیک نیتی کے باوجود اسی زندگی میں قتل کر دیا جائے، اور پھر اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں ڈال دیتا ہے، ان تمام نیک اعمال کو نظر انداز کرتے ہوئے جو انہوں نے بنی نوع انسان کے لیے کیے ہیں۔

ایک اسلامی مبلغ نے مزید یہ عذر پیش کیا:

> اگر کوئی یہ کہے کہ وہ اللہ کو اپنا رب ماننا نہیں کیونکہ اسے اس دنیا میں یاد نہیں کہ اس نے اپنی پیدائش سے قبل اللہ کے ساتھ کوئی وعدہ کیا تھا جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت 172 میں مذکور ہے تو یہ دلیل قابل قبول نہیں ہے۔ اللہ نے ہم سب کو اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکالا ہے اور ہمیں یاد نہیں ہے کہ ہم کبھی اپنی ماوؤں کے پیٹ میں تھے۔ تو کیا اس بنیاد پر ہمیں انکار کر دینا چاہیے کہ ہم کبھی ماوؤں کے پیٹ میں ہی نہیں تھے؟

ہمارا جواب :

ہمیں آج ماں کے پیٹ میں ہونا یاد نہیں، لیکن ہمیں ہماری ماں یاد ہے جو ہمارے سامنے نمودار ہوئی، اور دوسروں نے ہمیں اس کے پیٹ میں دیکھا ہے۔ بے شمار گواہ بطور ثبوت موجود ہیں۔

تاہم اس کہانی میں جہاں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو آدم کی کمر سے نکالنے کے بعد ان سے عہد لیا، کیا اس کا ایک بھی گواہ یا کوئی اور ثبوت موجود ہے؟ اللہ غائب ہے، فرشتے غائب ہیں اور وحی غائب ہے اور معجزے بھی غائب ہیں۔ نتیجتاً، کوئی بھی اپنی مذہبی کہانیوں کے بارے میں ایسے دعوے کر سکتا ہے جہاں تمام گواہ 'غایب' ہوں اور ثبوت "ندارد" ہو۔

محمد صاحب کا دعویٰ: امتحان جائز ہے کیونکہ بنی نوع انسان نے خود اسے اپنے لیے منتخب کیا ہے

محمد صاحب نے مندرجہ ذیل دعویٰ لا کر امتحان کو درست ثابت کرنے کی کوشش بھی کی:

قرآن 33:72: إِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ **ظَلُومًا جَهُولًا**
ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ایسا کرنے سے ڈر گئے۔ لیکن آدمی نے اسے اٹھایا۔ یقیناً وہ **ظالم** اور **جاہل** ہے۔

ہمارا جواب:

ایک بار پھر وہی بات کہ یہ کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ فقط ایک دعویٰ ہے جس کا کوئی گواہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ثبوت۔ یہ ایسا ہی ہے کہ "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔" کوئی بھی شخص اپنے مذہب کے متعلق اٹھ کر ایسے دعوے کر سکتا ہے کہ اس کے خدا نے اس کے مذہب کا پیغام پہاڑوں اور زمین کو پیش کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ بغیر کسی ثبوت کے، صرف اس دعوے کی بنیاد پر کیسے ایسے شخص یا اس کے مذہب پر ایمان لایا جا سکتا ہے؟

مزید یہ کہ یہ دعوی در حقیقت اللہ پر مزید ذیل کے سوالات اٹھا رہا ہے:

1. انسان اس امانت کو برداشت کرنے پر کیوں راضی ہوئے؟
2. اس آیت کے مطابق یہ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کو **ظالم** اور **جاہل** پیدا کیا اور یہی واحد وجہ تھی کہ انسان نے اپنی جہالت کی وجہ سے اس امتحان کو قبول کر لیا۔
3. لہٰذا اگر اللہ نے انسانوں کو ظالم اور جاہل مخلوق بنایا ہے تو اصل **مجرم** خود اللہ ہے۔ اس کے لیے انسانوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور نہ ہی انہیں بلا جواز سزا دی جانی چاہیے۔
4. مزید برآں، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دعویٰ کیا ہے کہ **آسمان / زمین / پہاڑوں کو** بھی امتحان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، لیکن یہ بیان کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ

آسمان / زمین / پہاڑوں کی کوئی آزاد مرضی نہیں ہے اور نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ناکام ہو سکتے ہیں۔ نہ انکار کریں اور نہ ہی ایسا کرنے سے ڈریں کیونکہ وہ کبھی جہنم یا جنت میں نہیں گریں گے۔

انسانوں کو **ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ظالم اور جاہل** بنانا اللہ تعالیٰ کو اس کے ڈیزائن کے مطابق انسانوں کی اکثریت کو ابدی جہنم میں ڈالنے کے ظلم سے کیسے بچاتا ہے؟

اور جنات بے چارے تو اشرف المخلوقات بھی نہیں ہیں، لیکن محمد صاحب نے ان بے چاروں کو بھی ابدی جہنم میں دے ڈالا۔

> قرآن 7.179: وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ
> اور بے شک ہم نے جنوں اور انسانوں کی اکثریت کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔

بیچارے جنات۔

لیکن اچھی بات یہ ہے کہ جنات کا کوئی وجود نہیں سوائے مذہبی طور پر برین واش شدہ لوگوں کے ذہنوں کے۔

جبر (تقدیر) واختیار (فری ول) کا المیہ

یہ تضاد اسلام کی فکری ساخت کے سب سے گہرے اور حیران کن معموں میں سے ایک ہے۔ ایک طرف اسلام یہ اعلان کرتا ہے کہ ہر چیز اللہ کے جبر (الٰہی قضا و قدر، یعنی تقدیر اور فیصلے) کے تحت ہے، حتیٰ کہ کوئی پتہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں گرتا۔ لیکن دوسری طرف، یہی اسلام انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے، اور اس کے ظاہری اختیار کی بنیاد پر اسے جنت کی خوشخبری یا جہنم کی وعید سناتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر عمل پہلے سے اللہ کے حکم سے طے شدہ ہے تو انسان ان اعمال پر سزا یا جزا کا مستحق کیوں ہے کہ جن پر اس کا اختیار ہی نہیں؟ اور اگر انسان کے پاس واقعی آزاد ارادہ موجود ہے تو پھر قضا و قدر کا مفہوم کیا رہ جاتا ہے؟ یہ فکری تضاد نہ صرف اسلام کے نظریۂ تقدیر کو فلسفیانہ طور پر کمزور بناتا ہے بلکہ اس کے اخلاقی نظام کو بھی غیر منطقی ثابت کرتا ہے۔

اسلام کے بنیادی ڈھانچے میں یہ دو متضاد نظریات کیوں شامل ہیں؟ جواب بالکل واضح ہے۔ محمد کو دونوں کی ضرورت تھی۔ جبر (یعنی تقدیر) کا نظریہ لوگوں میں مکمل اطاعت اور سر جھکانے کا احساس پیدا کرتا تھا، جبکہ آزاد ارادے کا تصور انسان کے "عمل" کے ذریعے انعام و سزا کی لالچ فراہم کرتا ہے۔

محمد صاحب کو ان دونوں نظریات کی ضرورت تھی۔ ایک طرف وہ چاہتے تھے کہ ان کے پیروکار (مسلمان) جنت کے لالچ میں ان کے بتائے گئے "اعمال" کے ذریعے ان کی خدمت کریں۔ لیکن دوسری طرف، اگر درست اعمال کے باوجود مسلمانوں کو کہیں شکست کا سامنا ہو جائے، یا پھر لاکھ اللہ سے دعا کرنے کے باوجود کسی مسلمان کو اس کی مراد نہ ملے، تو محمد صاحب اس ناکامی کو اللہ کے جبر (تقدیر) کے سر پر ڈال دیں۔

ان دونوں نظریات کے امتزاج نے اس بات کو یقینی بنایا کہ لوگ ہر حال میں محمد صاحب کے حکم کے تابع رہیں اور ناکامی کی صورت میں بھی ان کے خلاف بغاوت نہ کریں۔

تقدیر کا جال: آدم اور موسیٰ کا مکالمہ

اسلامی روایات صاف بتاتی ہیں کہ اللہ خود لوگوں کو فطرتاً نافرمان پیدا کرتا ہے، پھر انہی گناہوں پر انہیں سزا دیتا ہے جن پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ انسان کے اعمال، اس کا ایمان اور کفر، حتیٰ کہ انبیاء کی غلطیاں تک، سب اللہ کے فیصلے کے مطابق پہلے سے طے شدہ ہیں۔

بخاری اور مسلم کی متعدد احادیث کے مطابق، موسیٰ (علیہ السلام) نے آدم (علیہ السلام) سے کہا:

> "آپ ہی وہ ہیں جنہوں نے اپنے گناہ کی وجہ سے انسانوں کو جنت سے نکالا اور انہیں مصیبت میں ڈال دیا۔"

آدم نے جواب دیا:

> "اے موسیٰ! کیا آپ مجھے اس چیز کا الزام دیتے ہیں جسے اللہ نے میری تخلیق سے پہلے ہی میرے لیے مقدر کر دیا تھا؟"

محمد صاحب نے فرمایا کہ **آدم نے موسیٰ پر اس دلیل کے ذریعے غلبہ حاصل کر لیا۔** (حوالہ: صحیح بخاری 6614، 4738؛ صحیح مسلم 2652 وغیرہ)

پس منظر میں روایت کے مطابق یہ مکالمہ اسراء کے دوران پیش آیا، جب محمد آسمانوں پر گئے اور اللہ سے "گفتگو" کی۔

لیکن اس حدیث کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آدم نے اپنے گناہ کا الزام شیطان پر نہیں بلکہ **اللہ کی تقدیر** پر رکھا۔ یعنی ان کے نزدیک **اللہ خود ان کے گناہ کا اصل ذمہ دار تھا** کیونکہ وہ عمل ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی "لکھا جا چکا" تھا۔

اگر آدم کے پاس **آزادیِ ارادہ** (Free Will) ہوتی تو ان کا جنت سے نکالا جانا ان کی اپنی غلطی ہوتا، لیکن خود ان کی بات کے مطابق، وہ تو صرف اللہ کے فیصلے پر عمل کر رہے تھے۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ **بنی نوع انسان کو جنت سے نکالنے کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ آدم؟ شیطان؟ یا وہ ہستی جس نے یہ سب کچھ پہلے سے طے کر رکھا تھا؟**

قرآن کی آیات جو "اختیار" کے تصور کو باطل کرتی ہیں

1. اللہ خود ہدایت اور گمراہی دیتا ہے

"فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ، وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ" (الأنعام 125)

ترجمہ:

جسے اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے، اس کا سینہ تنگ اور گھٹن والا کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔

یہ آیت واضح اعلان ہے کہ **ہدایت کا انحصار انسان کے عمل یا نیت پر نہیں بلکہ اللہ کی مرضی پر ہے۔**

2. اللہ دلوں پر مہر لگا دیتا ہے

"خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (البقرہ 7)

ترجمہ:

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

جب خدا خود دل پر مہر لگا دے، تو پھر انسان کفر یا ایمان کا فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟ یہ سزا نہیں بلکہ ایک "پہلے سے طے شدہ انجام" بن جاتا ہے۔

3. اللہ چاہے تو سب ایمان لے آئیں

"وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا" (یونس 99)

ترجمہ:

اگر تیرا رب چاہتا تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے۔

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اللہ نے خود یہ طے کیا کہ سب ایمان نہیں لائیں گے۔

4. اللہ جسے چاہے، بھٹکا دے

"يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ" (النحل 93)
ترجمہ:
وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

یہ ایک **عدالتی منطق کا کھلا تضاد** ہے۔ کیونکہ جسے خدا نے گمراہ کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے پاس نیکی یا ایمان کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ پھر ایسے شخص کو سزا دینا کیسا انصاف ہے؟

5. جو مصیبت بھی آتی ہے، وہ پہلے سے ہی کتاب میں لکھی جا چکی ہے

قرآن کہتا ہے:

"مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا" (الحدید 22)
ترجمہ:
زمین یا تمہاری جانوں پر جو بھی مصیبت آتی ہے، وہ پہلے سے ایک کتاب میں لکھی جا چکی ہے۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ انسان کے فیصلوں یا اعمال کا کوئی حقیقی اثر نہیں بلکہ ہر چیز پہلے سے "لکھی جا چکی ہے"۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر قاتل کا قتل کرنا پہلے سے لکھا تھا، تو وہ مجرم کیوں ہے؟ اگر چور کا چوری کرنا اللہ کی تقدیر میں تھا، تو پھر سزا کا مطلب کیا ہوا؟

ایسا لگتا ہے کہ اسلام میں انسان **ذمہ دار نہیں بلکہ مفعول ہے، یعنی** ایک ایسا کردار جو صرف وہی کرتا ہے جو پہلے سے طے ہے۔

6۔ نیکی اور گناہ دونوں اللہ کی مرضی سے

قرآن میں کئی آیات میں گناہ، کفر، اور ایمان کو **خود اللہ کے فیصلے** سے منسوب کیا گیا ہے۔

چند مثالیں دیکھیے:

> **"فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا"**
> (الانعام 125)
>
> ترجمہ:
>
> جسے اللہ ہدایت دینا چاہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جسے گمراہ کرنا چاہے، اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ **ہدایت بھی اللہ دیتا ہے اور گمراہی بھی وہی پیدا کرتا ہے۔**

اگر دلوں پر مہر لگانے والا اللہ ہے، تو پھر ان کے ایمان نہ لانے پر ان کی سزا کیوں دی جائے؟ یہ اخلاقی طور پر ایک ظالمانہ اصول ہے۔

علمائے اسلام کی طرف سے ان دو متضاد عقیدوں کے دفاع میں مختلف تاویلات، مگر وہ بھی آپس میں متضاد

علمائے اسلام کو بھی ان متضاد عقیدوں، اور ان کی وجہ سے اسلام پر اٹھتے سوالات اور شکوک کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ایسی تاویل بیان کا جاسکے کہ جس سے اس تضاد سے جان چھوٹ سکے۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے جو تاویلات بیان کیں (جو کہ اصل میں اپنی طرف سے گھڑے گئے عذر تھے)، وہ آپس میں بھی متضاد نکل آئیں۔

جب ان روایات سے یہ بات صاف ظاہر ہونے لگی کہ آدم کا گناہ دراصل ان کا "اختیاری" عمل نہیں تھا بلکہ اللہ کی ازلی تقدیر کا حصہ تھا، تو مفسرین اور علماء ایک مشکل میں پھنس گئے۔ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تو اسلام کا پورا اخلاقی نظام گر جاتا، کیونکہ پھر کوئی بھی انسان اپنے گناہوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرتا۔ لہٰذا، انہوں نے تاویلات کا

ایک ایسا جال بنانا شروع کیا جو بظاہر تقدیر اور اختیار کو ہم آہنگ دکھائے، مگر حقیقت میں تضاد کو اور زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا کہ **آدم کا قصور ایک "اجتہادی غلطی" تھی**، یعنی ان کی نیت اچھی تھی مگر عمل میں خطا ہو گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب پہلے سے اللہ نے طے کیا تھا، تو نیت، خطا اور اجتہاد سب کے سب اسی تقدیر کے تابع ہوئے۔

دوسروں نے کہا کہ **اللہ نے تقدیر لکھی ضرور تھی مگر زبردستی نہیں کی۔** لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں بار بار یہ کہتے ہیں کہ **اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔**

علمائے اسلام نے اس تضاد سے بچنے کے لیے کبھی "جبر و اختیار کے درمیان راستہ" نکالنے کی کوشش کی، کبھی "کسب" کا مفہوم گھڑا، کبھی کہا کہ اللہ نے بس "علم" رکھا ہے مگر زبردستی نہیں کی۔ مگر ان تمام تاویلات کے باوجود ایک بنیادی سوال ہمیشہ باقی رہا کہ **اگر اللہ کو معلوم ہے کہ فلاں شخص گمراہ ہونے والا ہے، پھر بھی وہ اسے پیدا کرتا ہے، تو یہ انصاف کیسے ہوا؟**

1. اہل السنہ (اشعری و ماتریدی) کا مؤقف: "کسب" کا فلسفہ

اشعری مکتب کے مطابق:

> "ہر عمل دراصل اللہ ہی پیدا کرتا ہے، لیکن انسان اسے **'کسب'** کرتا ہے، یعنی اسے اپنی طرف سے اختیار کرتا ہے۔"

یہ وہ مشہور **نظریہ کسب** (Doctrine of Acquisition) ہے۔

- حرکت دینے والا اللہ ہے،
- لیکن ذمہ دار انسان ہے۔

یہ فلسفہ محض الفاظ کی بازیگری ہے۔ اگر عمل **پیدا کرنے والا اللہ** ہے، اور انسان صرف **اختیار کرنے والا** ہے، تو پھر یہ اختیار صرف ایک دکھاوا ہے۔

امام رازی نے خود اعتراف کیا کہ:

> "یہ مسئلہ عقل سے نہیں، بلکہ صرف تسلیم سے حل ہوتا ہے۔"

2. معتزلہ کا مؤقف: "انسان خالقِ فعل ہے"

معتزلہ نے کہا:

> "اگر اللہ سب اعمال خود پیدا کرتا ہے، تو پھر عدل کہاں گیا؟ اس لیے اعمال کا خالق تو انسان خود ہے۔"

یعنی ان کے نزدیک خدا **ہدایت و گمراہی کی صلاحیت دیتا ہے،** لیکن **فیصلہ انسان خود کرتا ہے۔**

یہ مؤقف بظاہر زیادہ عقلی لگتا ہے، مگر ایک سنگین مسئلہ پیدا کرتا ہے: یعنی اگر انسان خود اپنے اعمال کا **خالق** ہے، تو پھر اس کا مطلب ہوا کہ **اللہ کے سوا اور خالق بھی موجود ہیں۔**

چنانچہ معتزلہ کا یہ عقیدہ قرآن کے بنیادی عقیدے "اللّٰہُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" سے متصادم ہو گیا۔ اسی وجہ سے ان کے مخالف علماء نے انہیں "منکرینِ تقدیر" قرار دے کر کافر قرار دے دیا۔

3. اشاعرہ کا موقف: انسان کا اختیار صرف "ظاہری" ہے

اور اشاعرہ کا ہی اگلا موقف یہ بھی تھا کہ جہاں انہوں نے ایک درمیانی راہ نکالی:

> "خدا نے سب کچھ طے کیا، مگر انسان کو اس فیصلے کے اندر 'ظاہری اختیار' دیا ہے۔"

مگر یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے کوئی قید خانے میں قیدی کو کہے کہ دروازہ بند ہے، مگر تم آزاد ہو، جو چاہو کرو۔

ان دو متضاد عقائد کی وجہ سے الٰہی عدل پر اٹھتے سوال

اسلامی علماء جب "عدل" کے سوال سے دوچار ہوئے، تو ان کے پاس دو راستے تھے:

1. یا تو مانیں کہ اللہ نے بعض لوگوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا، اور یہ عدل نہیں۔

2. یا پھر کہیں کہ **جو کچھ اللہ کرتا ہے وہ عدل ہی ہے، چاہے انسان کی نظر میں ظلم لگے۔**

اکثر علماء نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ امام غزالی لکھتے ہیں:

> "اللہ اگر سارے نیکوں کو جہنم میں ڈال دے، اور سارے گناہگاروں کو جنت میں داخل کرے، تب بھی یہ عدل ہے، کیونکہ عدل کا معیار صرف اللہ کی مرضی ہے۔"
> (احیاء العلوم، جلد 4)

یعنی **عدل کی تعریف بھی اللہ کے تابع** کر دی گئی۔

محمد صاحب کا ان دونوں متضاد اسلامی عقائد کا سیاسی استعمال

محمد صاحب نے **جبر (تقدیر)** اور **اختیار (فری ول)** کے ان دونوں متضاد عقائد کو اپنے سیاسی اور حکومتی مفاد کے لیے انتہائی کامیابی سے استعمال کیا۔ یہ یوں ہوا:

1. **لوگوں کو مذہب اپنانے پر مجبور کرنا:**

جب وہ چاہتے کہ لوگ اسلام قبول کریں، تو انہیں یہ باور کروایا جاتا کہ **ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔**

2. **ایمان کے بعد مکمل اطاعت کا مطالبہ:**

جب لوگ اسلام قبول کر لیتے، تو ان سے **مکمل طور پر احکامات پر عمل کرنے، فرمانبردار اور مطیع رہنے** کا مطالبہ کیا جاتا۔

3. ناکامی یا شکست کی صورت میں تقدیر کا بہانہ:

جنگ یا فتوحات میں شکست ہوتی، تو فوراً **"تقدیر" کا کھیل** کھیلنا شروع کر دیتے۔ مثال کے طور پر جنگ اُحد میں ناکامی پر اعلان ہوتا:

> " قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا "(التوبہ 51)
>
> ترجمہ:
>
> یعنی ہمیں کچھ نہیں پہنچے گا سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔

اسی طرح اللہ سے لاکھ دعاوٴں کے باوجود اگر کوئی بیمار تندرست نہ ہوتا، یا بیمار کو درد سے نجات نہ ملتی، تو محمد صاحب اس ناکامی کا ملبہ اللہ کے جبر (قضاو قدر، یعنی تقدیر) پر ڈال دیتے۔

یہ ایک **نفسیاتی حربہ** تھا۔ یعنی کبھی سب کچھ اللہ کی مشیت قرار پاتا، اور کبھی انسان کی اپنی غلطی۔ یہ متضاد بیانات **صرف ایک مقصد کے لیے تھے: اختیار اور جوابدہی محمد کے پاس رہے، سوال عوام نہ کرے۔**

4. تقدیر کو ایمان کا جزو بنانا

محمد صاحب نے تقدیر کو **ایمان کے بنیادی ارکان میں شامل کر دیا**۔ حدیث میں آتا ہے: "تقدیر پر ایمان لانا ایمان کے چھ ارکان میں سے ایک ہے۔"

جب ظلم کو "اللہ کی مشیت" کہہ دیا جائے، **تو اس کے خلاف احتجاج خود مذہبی بغاوت بن جاتا ہے۔**

تقدیر: خلفائے بنو امیہ کا سب سے طاقتور سیاسی ہتھیار

اسلامی تاریخ میں سب سے واضح مثال **بنو امیہ** کے دور کی ہے۔ اموی خلفاء نے تقدیر کے عقیدے کو باقاعدہ **سیاسی پروپیگنڈا** بنا دیا۔ وہ عوام کو کہتے:

> "ہماری حکومت اللہ کی تقدیر سے ہے۔ اگر ہم ظالم ہیں، تو یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہے۔"

ایک مشہور قول معاویہ بن ابی سفیان کا ہے: "جو کچھ ہمیں ملا ہے وہ اللہ کی تقدیر ہے، جس نے ہمیں روکا، اس نے اللہ کے فیصلے سے روکا۔"

یعنی اقتدار بھی اللہ کا فیصلہ،

اور ظلم بھی اللہ کی مرضی۔

چنانچہ خلیفہ **ہشام بن عبد الملک** نے غیلان دمشقی کو قتل کروا دیا، جن کا جرم یہ تھا کہ وہ کہہ رہے تھے: "اللہ ظالم نہیں ہو سکتا۔" یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ **اسلامی تقدیر کا عقیدہ اصل میں اقتدار کے تحفظ کے لیے استعمال ہوا۔**

نتیجہ: فلسفہ کے پردے میں ظلم کی توجیہ

یہ تمام مکاتب (اشعری، ماتریدی، معتزلی) ایک ہی مقام پر آکر رک گئے کہ کسی کے پاس **انسانی اختیار کا حقیقی جواز** نہیں تھا۔

- اشعریوں نے کہا: "سب اللہ کا فیصلہ ہے۔"
- معتزلہ نے کہا: "انسان خود خالق ہے، مگر پھر اللہ کی قدرت کم پڑتی ہے۔"
- صوفیاء نے کہا: "سب کچھ ایک خواب ہے، عمل بھی، سزا بھی۔"

آخر کار اسلام کے اندر تقدیر کا عقیدہ **ایک آفاقی ظلم کی توجیہ بن گیا،** ایسا ظلم جو "اللہ کی مرضی" کہہ کر تقدس میں لپیٹ دیا گیا۔ خلفاء اور مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ یہی چیز اپنے سیاسی فائدے کے لیے استعمال کی۔

اخلاقیات کا ماخذ: (مذہب یا پھر انسان خود)

اہل مذہب عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اخلاقیات کا واحد سرچشمہ مذہب ہے، اور یہ کہ آج کے غیر مذہبی یا مغربی معاشرے اپنی اخلاقیات دراصل مذاہب ہی سے مستعار لیتے ہیں۔ اس دعوے کے مطابق، اگر مذہب نہ ہو تو انسان اخلاقی طور پر بے لگام ہو جائے۔

لیکن جدید سائنس، خاص طور پر ارتقائی حیاتیات، نیوروسائنس اور نفسیات، نے اس تصور کو سنجیدگی سے چیلنج کیا ہے۔ ان علوم کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اخلاقیات کوئی آسمانی تحفہ نہیں، بلکہ انسان کے اندر موجود فطری رجحانات، ذہنی صلاحیتوں اور سماجی تجربات کے باہمی تعامل کا نتیجہ ہیں۔

اخلاقی رویوں کے اندرونی ماخذ: دو متضاد ارتقائی رجحانات

انسانی اخلاقیات کی بنیاد دو ایسے رجحانات پر ہے جو بظاہر ایک دوسرے کے مخالف ہیں، مگر ارتقا کے لیے دونوں یکساں طور پر ضروری رہے ہیں۔

1. اپنی بقا اور خودغرضی کا رجحان

یہ رجحان انسانی ارتقا کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کا مقصد فرد اور اس کے قریبی رشتوں کی حفاظت ہے۔ خطرے کی صورت میں یہی رجحان انسان کو فوری ردعمل، جارحیت اور اپنی ذات کو ترجیح دینے پر آمادہ کرتا ہے۔

حیاتیاتی سطح پر کورٹیسول اور ایڈرینالین جیسے ہارمونز اس رجحان کو متحرک کرتے ہیں، جو انسان کو لڑو یا بھاگو کی کیفیت میں لے آتے ہیں۔ یہ ہارمونز اخلاقیات پیدا نہیں کرتے، بلکہ بقا سے جڑے ان فطری رجحانات کو فعال کرتے ہیں جن پر بعد میں عقل کام کرتی ہے۔

اگر یہ رجحان بے قابو ہو جائے تو یہی بقا کی جبلت ظلم، استحصال اور دوسروں کو اپنے فائدے کے لیے **"قربان"** کرنے جیسی صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔

2. دوسروں سے ہمدردی (Empathy) اور سماجی تعاون کا رجحان

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا رجحان بھی ہے، جو فرد کے بجائے گروہ کی بقا سے جڑا ہوا ہے۔ انسان تنہا زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لیے ارتقا نے ہمیں ہمدردی، محبت، تعاون اور قربانی کی صلاحیت عطا کی۔

آکسیٹوسن اور سیروٹونن جیسے نیوروکیمیکلز اعتماد، لگاؤ اور تعلق کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ ہارمونز بھی اخلاقیات کی تخلیق نہیں کرتے، بلکہ اس ہمدردانہ رجحان کو ممکن بناتے ہیں جسے ہم عام زبان میں انسانیت کہتے ہیں۔

یہ رجحان ہمیں دوسرے کے درد کو محسوس کرنے اور بعض اوقات اپنے مفاد کو دوسروں کی بہتری کے لیے "**قربان**" کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

انسانی جبلت:

اگر مذہب کی زبان (یعنی اچھائی اور برائی) کے سیاق میں بات کی جائے تو نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ: **انسان جبلی طور پر کامل نہیں ہے۔ جہاں ایک طرف اس میں اچھائی موجود ہے (دوسروں کا درد محسوس کرنا)، وہیں پر اس میں سیلف انٹرسٹ (خود کا فائدہ ڈھونڈنے کی حس) بھی جبلی طور پر موجود ہے۔**

(نوٹ: نیوروکیمیکل ہارمونز کا کردار کہیں پیچیدہ ہے اور بہت سی جذباتی پیچیدگیاں مزید ہیں جیسا کہ محبت، غصہ، خوف، شرم، تجسس وغیرہ جو کہ اخلاقی فیصلوں میں کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن یہاں ہم انہیں بحث میں آسانی کی خاطر فی الحال نظر انداز کر رہے ہیں کیونکہ بنیادی بحث کا نکتہ یہ ہے کہ آیا اچھائی اور برائی کی اخلاقیات مذہب سے آئی ہیں یا پھر انسان سے)

عقل و شعور کا کردار

اگر انسانی اخلاقیات صرف ہارمونز کے تابع ہوتیں تو انسان ایک حیاتیاتی روبوٹ سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ مگر انسان صرف جبلتوں کا غلام نہیں۔ بلکہ ارتقا نے ہمیں جبلتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی عقل اور شعور بھی عطا کیے۔

یہی عقل ہمیں یہ صلاحیت دیتی ہے کہ ہم:

- اپنے تجربات سے سیکھ سکیں
- مستقبل کے ممکنہ نتائج کا اندازہ لگا سکیں
- اپنی خودغرض جبلت کو محدود یا درست سمت میں استعمال کر سکیں
- اور ہمدردی کو اندھی قربانی بننے سے بچا سکیں

یوں اخلاقیات دراصل جبلتوں اور عقل کے درمیان ہونے والا ایک مسلسل مکالمہ ہیں، کوئی جامد آسمانی حکم نہیں۔ اپنی عقل و شعور سے ہم اپنی انسانی جبلتوں اور رجحانات کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ یہی چیز ہمیں جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

نیوروسائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اخلاقی فیصلہ سازی کے دوران دماغ کے مخصوص حصے فعال ہوتے ہیں۔ دماغ کا جذباتی حصہ (لیمبک سسٹم) اور منطقی حصہ (پری فرنٹل کورٹیکس) آپس میں مقابلہ کرتے ہیں۔ یعنی اخلاقی فیصلہ سازی کوئی آسمانی حکم نہیں بلکہ دماغ میں ہونے والی حیاتیاتی اور منطقی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

بیرونی اثرات: معاشرہ اور مذہب

چھوٹے بچوں پر تحقیق سے پتا چلا ہے کہ انہیں کوئی مذہبی تعلیم ملنے سے پہلے ہی وہ انصاف اور ناانصافی میں فرق کر سکتے ہیں۔ ایک بچہ جب کسی پیار کرنے والی ہستی کو دیکھتا ہے، تو فطری طور پر پیار سے اس کی طرف بانہیں پھیلا دیتا ہے۔ یہی بچہ اگر ماں کو روتے دیکھے یا درد میں دیکھے تو پریشان ہو کر رونے لگتا ہے۔ کسی نے اسے یہ نہیں سکھایا۔

مگر جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا ہے، اس کے اندرونی رجحانات پر بیرونی عوامل اثر انداز ہونے لگتے ہیں، جو عملی اخلاقی رویوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً

ذاتی تجربہ:

انسان غلطیاں کرتا ہے، ان کے نتائج بھگتتا ہے، ان سے سبق سیکھتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے اخلاقی فیصلے خود تشکیل دیتا ہے۔

سماجی اور مذہبی تعلیم

بچپن سے نکل کر بڑے ہوتے ہی خاندان، معاشرہ اور مذہب اثر ڈالنا شروع ہو جاتے ہیں اور انسان کو بتاتے ہیں کہ کیا درست ہے اور کیا غلط۔ یہ تعلیم بعض اوقات انسانی ہمدردی کو نکھارتی ہے اور بعض اوقات اسے محدود یا دبا بھی دیتی ہے۔

یہاں ایک نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ مذاہب اخلاقیات کا فطری سرچشمہ نہیں، بلکہ انہوں نے پہلے سے موجود انسانی اخلاقی رجحانات کو منظم، ضابطہ بند اور ادارہ جاتی شکل دی۔ یہ سماجی بقا کے لیے ایک تاریخی ضرورت تھی۔

لیکن اسی عمل میں اکثر ہمدردی کو صرف اپنے گروہ تک محدود کر دیا گیا، اور باہر والوں کے لیے اخلاقی حساسیت اور ہمدردی کمزور پڑ گئی۔

عقل بطور پیمانہ

انسانی عقل ہمیں یہ صلاحیت دیتی ہے کہ ہم ہر بیرونی (یعنی سماجی اور مذہبی) حکم اور تعلیم کو "پرکھ" سکیں۔
ہمارے اندر موجود انصاف اور ہمدردی کا فطری احساس ایک پیمانے کے طور پر کام کرتا ہے، جس سے ہم اچھے اور برے میں تمیز کر سکتے ہیں۔

اسی لیے جب کوئی حکم بنیادی انسانی ہمدردی یا انصاف کے خلاف جاتا ہے تو بہت سے انسانوں کے اندر ایک اندرونی مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ یہی مزاحمت اس بات کا اشارہ ہے کہ اخلاقیات کا سرچشمہ کسی کتاب یا روایت سے بالاتر، انسان کی اپنی جبلی ساخت میں موجود ہے۔

میرا ذاتی سفر: جب انسانیت اور مذہب آمنے سامنے آئے

میں ایکس مسلم ہوں۔ جب میں مسلمان تھا اور سچے دل سے اللہ پر ایمان رکھتا تھا، تب بھی میرے اندر کچھ چیز مجھے بے چین کرتی تھی۔ مثلاً:

- ارتداد کی سزا موت - یہ میرے اندر کی انصاف کی حس کے خلاف تھا
- جنگی قیدی عورتوں کا جنسی استحصال - یہ بھی

میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے خیال میں بہت سے مسلمان اندر سے یہ بے چینی محسوس کرتے ہیں۔

مگر ہمدردی کا یہ رجحان مذہبی معاشرے کی دی گئی اس "تعلیم / **برین واشنگ**" سے نیچے دب گیا کہ اللہ سب سے بڑا علیم و حکیم اور دانا ہے، اور ہم انسانوں کی "محدود عقلیں" اس کی دانائی کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔

جی ہاں، میں نے (یعنی میری عقل نے) اُس وقت بھی غور و فکر کیا تھا اور "**انسانیت کی آواز**" اور "**معاشرتی تعلیم کی دلیل (اللہ کی دانائی)**" کا تقابل کیا تھا اور پھر عقل کی بنیاد پر ہی فیصلہ دیا تھا کہ اللہ کی دانائی کو ہمدردی کے رجحان پر فوقیت حاصل ہے۔ یوں، اس عقلی دلیل کے ذریعے میں نے اپنے اندر انسانیت کی آواز کے خلاف جاتے ہوئے بھی خود کو "پر سکون" کر لیا تھا۔

غلطی میری عقل کی نہیں تھی، بلکہ اُس وقت میری عقل یہ مان کر چل رہی تھی کہ آسمان میں واقعی کسی اللہ کا وجود ہے اور وہ میری محدود عقل سے کہیں زیادہ دانا ہے۔

تبدیلی کا لمحہ: یہ چیز تبدیل اس وقت ہونا شروع ہوئی جب میری عقل نے براہ راست خود اللہ کے وجود کو چیلنج کرنا شروع کیا۔ اور جب خدا کے وجود کا تصور درہم برہم ہوا، تو پھر اس تصور سے جڑے دیگر تصورات بھی خود بخود منہدم ہونا شروع ہو گئے اور میرے اخلاقی رویے تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔

عقل اور عقل کا استعمال: ایک نفسیاتی جدوجہد

ایک اہم سبق جو ہمیں یاد رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ **"عقل"** ایک صلاحیت ہے، جبکہ **"عقل کا استعمال"** ایک ارادی عمل۔ عقل تو قدرت نے ہر انسان کو ودیعت کی ہے، لیکن معاشرتی کنڈیشننگ اور مذہبی تعلیمات اس پر دبیز پردے ڈال کر اسے اندھا کر دیتی ہیں۔

اس ذہنی اندھیرے کو دور کرنے کا واحد راستہ عقل کا مسلسل استعمال، سوالات کی بوچھاڑ اور 'شک' کی ہمت پیدا کرنا ہے۔ لیکن یہ عمل اتنا سادہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک داخلی جنگ ہے۔

آپ یہ سوالات صرف اس وقت اٹھا سکتے ہیں جب آپ اپنے اندر موجود **"خوف"** اور **"اندھی تعظیم"** جیسے احساسات سے پیدا ہونے والے حیاتیاتی دباؤ (Hormonal Pressure) پر قابو پانا سیکھ لیں۔ جب تک آپ کا دماغ سزا کے خوف یا مقدس ہستیوں کی ہیبت میں مبتلا رہے گا، عقل مفلوج رہے گی۔ [نوٹ: سائنسی زبان میں، مذہب اکثر "خوف" (جہنم) اور "لالچ" (جنت) کے ذریعے انسانی دماغ کے ایمیگڈالا (Amygdala) اور ڈوپامائن (Dopamine) کے نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔]

عقل کے حقیقی استعمال کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے **"حسِ انصاف" (Sense of Justice)** کو خوف پر غالب لائیں اور اسے اتنی طاقت دیں کہ وہ مروجہ سماجی و مذہبی ڈھانچوں کو چیلنج کر سکے۔

آخر کار، یہی وہ جراتمندانہ سوالات ہیں جو معاشرے اور مذہب کی صدیوں پرانی جکڑبندیوں کو توڑنے کا سبب بنتے ہیں۔

نتیجہ: اعتدال کی تلاش

عملی زندگی میں انسان کو ہمیشہ بقا کی خود غرضی اور ہمدردی کی قربانی کے درمیان اعتدال قائم کرنا ہوتا ہے۔

زیادہ ہمدردی انسان کے اپنے وجود کو فنا کے خطرے میں ڈال سکتی ہے، جبکہ زیادہ خود غرضی انسان کو دوسروں کے لیے ظالم بنا سکتی ہے۔

اخلاقیات کا سرچشمہ دراصل ان تینوں عوامل (متضاد حیاتیاتی رجحانات، آزاد عقل و شعور، اور سماجی تعلیم) کے باہمی عمل سے پیدا ہونے والے اس اعتدال کی دائمی تلاش میں ہے، جو فرد کی بقا اور معاشرتی ذمہ داری کے درمیان ایک متوازن راستہ فراہم کرتا ہے۔

مذاہب: انسانی ساختہ نظام

جب ہم مذاہب کو انسانیت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، تو ہمیں مذاہب میں اچھائی بھی نظر آتی ہے اور برائی بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذاہب **انسانوں** نے بنائے ہیں، اس لیے ان میں **انسانوں کی خامیوں اور خوبیوں** کا عکس نظر آتا ہے۔ مذاہب میں:

- **اچھائی** اس لیے ہے کیونکہ انسانوں نے اخلاقی اقدار کو سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کی۔
- **برائی** اس لیے ہے کیونکہ انسانوں نے اپنے **سیلف انٹرسٹ، طاقت، اور کنٹرول** کے لیے بھی مذاہب کا استعمال کیا۔

چنانچہ انسان کو اخلاقیات سیکھنے کے لیے مذہب کی بطور رہنما ضرورت نہیں، بلکہ مذاہب کے مطالعے کی علم حاصل کرنے کی غرض سے ضرورت ہے۔

مذاہب سے **سبق** سیکھنا چاہیے، ان کی **غلامی** نہیں کرنی چاہیے۔

کیا ہارمونز ہمیں objective اخلاقیات دیتے ہیں؟

نہیں، ہارمونز نہ تو خود اخلاقیات ہیں، اور نہ ہی وہ ہمیں مکمل طور پر objective اخلاقیات کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہاں، البتہ ہارمونز کچھ حد تک biological objectivity کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

Objective پہلو:

- تمام انسانوں میں empathy کے لیے آکسیٹوسن کام کرتا ہے

- درد دیکھ کر تقریباً سب میں ہمدردی کا احساس پیدا ہوتا ہے

- یہ universal biological responses ہیں

Subjective پہلو:

- ہر شخص میں ہارمونز کی سطح مختلف ہوتی ہے

- کچھ لوگ naturally زیادہ empathetic ہیں، کچھ کم

- معاشرتی تربیت ان biological responses کو modify کر دیتی ہے

"عقل" کا کردار **Objective** ہے یا **Subjective**؟

بظاہر عقل کی بنیاد پر کیے گئے فیصلے Subjective ہی لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر، ایک ہی مسئلے پر مختلف لوگ مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں، حالانکہ سب عقل استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

عقل کا بنیادی کام Data Processing کی طرح کا ہے۔ عقل خود سے کوئی ڈیٹا پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ اسے input ملتی ہے، جسے وہ process کرتی ہے، اور پھر output دیتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عقل کو input کہاں سے ملتی ہے؟ تو اس کے دو ماخذ ہیں۔

پہلا ماخذ: ہمارے اندرونی جبلی رجحانات

یہ ہمارے اندر موجود مختلف جبلی رجحانات ہیں جو کہ ہارمونز کے تابع ہیں۔ مثلاً ان میں شامل ہیں:

- ہمدردی کا رجحان

- بقا اور خود غرضی کا رجحان

- دیگر محسوسات جیسے محبت، غصہ، خوف، شرم، تجسس وغیرہ

یہ سب اخلاقی فیصلوں میں کردار ادا کرتے ہیں۔

نوٹ کرنے والی اہم بات: یہاں سے عقل کو "متضاد" input مل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، ہمدردی کا رجحان کہتا ہے کہ دوسرے کی مدد کرو، جبکہ خود غرضی کا رجحان کہتا ہے کہ اپنا فائدہ دیکھو۔ عقل کو اب فیصلہ کرنا ہے کہ کس input کو ترجیح دی جائے۔

دوسرا ماخذ: بیرونی ماحول، تربیت اور مذہب

یہ ہماری تربیت، ماحول، معاشرہ، خاندان اور مذہب وغیرہ سے ملنے والی input ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ **یہاں بھی عقل کو "متضاد" input مل سکتا ہے۔** مثال کے طور پر:

- ہمارے قریبی لوگ (مثلاً فیملی ممبرز) بچپن سے بتاتے ہیں کہ اللہ موجود ہے
- معاشرے سے بعد میں یہ input بھی ملتا ہے کہ بعض دور کے لوگوں کے مطابق اللہ موجود نہیں ہے

اب سوال یہ ہے کہ عقل کن لوگوں کی بات کو زیادہ "وزن" دے گی؟

یہاں ہارمونز دوبارہ کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جو:

- ہمارے قریبی ہیں (خاندان، دوست)
- اختیار کی پوزیشنوں میں ہیں (والدین، استاد، مذہبی علماء)
- جن سے ہمارا جذباتی تعلق ہے
- جن کی بات ہم بار بار سنتے ہیں

یہ evolutionary survival کے لیے ضروری تھا۔ قریبی رشتے داروں پر بھروسہ کرنا بقا کے لیے اہم تھا۔

چنانچہ عقل معاشرے سے ملنے والے input data میں قریبی اور اعتماد والے لوگوں کی بات کو زیادہ "وزن" دے گی۔

یہ عقل کی غلطی نہیں ہے۔ یہ اس طریقے سے کام کر رہی ہے جس طریقے سے اسے evolution نے بنایا ہے۔

میرے اپنے تجربے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ **جب میں مسلمان تھا** تو اس وقت میری عقل کو یہ inputs مل رہے تھے:

- میرے قریبی لوگ کہہ رہے تھے کہ اللہ موجود ہے
- میرا ماحول کہہ رہا تھا کہ اسلام سچا ہے
- مجھے بار بار سکھایا گیا تھا کہ اللہ کی دانائی لامحدود ہے

اس وقت میں نے عقل کی بنیاد پر ہی فیصلہ دیا تھا کہ:

- مرتد کا قتل درست ہے
- غلامی جائز ہے
- کیونکہ اللہ موجود ہے اور اس کی دانائی میری محدود عقل سے کہیں بلند تر ہے

نوٹ کریں: یہ بھی عقل کا فیصلہ تھا۔ میں نے سوچا، غور کیا، اور نتیجہ نکالا۔

مگر بعد میں جب عقل نے "**خوف**" کے احساس سے نکل کر خود اللہ اور قریبی رشتے داروں کی "بات" پر سوال اٹھانے شروع کیے، تو پھر صورتحال بدل گئی۔ اب میری عقل کو نئے inputs مل رہے تھے:

- اللہ کے وجود پر خود سوالات
- اسلامی تعلیمات میں تضادات
- دوسرے لوگوں کے مختلف نقطہ نظر

اب اسی عقل نے پہلے سے مختلف طریقے سے data کو process کیا، اور نتیجہ نکالا کہ:

- مرتد کا قتل غلط ہے
- غلامی انسانیت کی توہین ہے

جب انسان خوفزدہ ہوتا ہے، تو دماغ کا منطقی حصہ (Prefrontal Cortex) مفلوج ہو جاتا ہے اور بقا کی جبلت (Survival Instinct) کنٹرول سنبھال لیتی ہے۔

صرف خوف ہی نہیں بلکہ شدید عقیدت، اور یہاں تک کہ محبت بھی پری فرنٹل کورٹیکس (Prefrontal Cortex) کو اسی طرح "بائی پاس" یا مفلوج کر سکتی ہے جیسے خوف کرتا ہے۔

جب انسان کسی بہت بڑی ہستی، طاقت یا تصور کی "تعظیم" میں ہوتا ہے، تو دماغ کا وہ حصہ جو ہماری "انا" کو کنٹرول کرتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے۔ جب انا چھوٹی ہو جاتی ہے، تو انسان سوال اٹھانے کی صلاحیت کھو دیتا ہے کیونکہ سوال اٹھانے کے لیے ایک "خود مختار وجود" کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب آپ کسی ہستی کو "کامل" یا "مقدس" مان لیتے ہیں، تو دماغ لاشعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اب "تجزیہ" کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح دماغ توانائی بچانے کے لیے منطق کا سوئچ آف کر دیتا ہے۔

خوف میں "ایڈرینالین" اور "کورٹیسول" نامی سٹریس ہارمونز کام کرتے ہیں، جبکہ تعظیم اور محبت میں آکسیٹوسن اور ڈوپامائن نامی ہارمونز کا سیلاب آتا ہے۔

آکسیٹوسن انسان کو "اعتبار" پر مجبور کرتا ہے۔ جب اس ہارمون کی مقدار بہت زیادہ ہو جائے، تو دماغ کا وہ حصہ جو "دھوکے" یا "غلطی" کی نشاندہی کرتا ہے (Amygdala کا وہ حصہ جو خطرے کو بھانپتا ہے)، سست پڑ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے، یعنی عقل کا معطل ہو جانا۔

چنانچہ، نتائج کچھ یوں نکلتے دکھائی دے رہے ہیں کہ:

- عقل بنیادی طور پر subjective ہی ہے۔
- عقل hormones کے اثر سے مکمل آزاد نہیں ہے، لیکن عقل hormones کو override بھی کر سکتی ہے۔
- ماحول کی وجہ سے عقل کی "برین واشنگ" بھی ایک حقیقت ہے، لیکن عقل اس ماحولیاتی برین واشنگ کو بھی override کر سکتی ہے۔

نیز، جب مذہبی حضرات کہتے ہیں کہ "objective morality صرف خدا سے آتی ہے"، تو ہمیں ان سے یہ سوالات پوچھنے چاہئیں:

- مختلف مذاہب کے مختلف احکام میں کون "objective" ہے؟ کون فیصلہ کرے گا؟
- اگر آپ کی عقل ہی یہ فیصلہ کر رہی ہے کہ کون سا مذہب صحیح ہے، تو پھر عقل ہی بنیادی authority کیوں نہیں؟
- اگر آپ کی عقل خدا کے احکام کو "پرکھ" سکتی ہے اور ان کی تشریح کر سکتی ہے، تو یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ اخلاقیات کا اصل ماخذ انسانی عقل اور empathy ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی "objective morality" دراصل **"authoritarian morality"** ہے۔ اور یہ ایک بددیانتی ہے کیونکہ:

- اس authority کو ماننے کا فیصلہ خود subjective تھا
- اس authority کی تشریح بھی subjective ہے
- مختلف لوگ مختلف authorities کو مانتے ہیں

خلاصہ:

مکمل objective morality ممکن نہیں۔ نہ مذہب میں اور نہ ہی غیر مذہبی نظام میں۔

جی ہاں، مذاہب لاکھ مکمل آبجیکٹیو اخلاقیات کا دعویٰ کرتے رہیں، مگر ان کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے۔

جبکہ غیر مذہبی نظام سرے سے مکمل آبجیکٹیو اخلاقیات کا دعوی کرتے ہی نہیں ہیں کیونکہ ہمیں پتا ہے کہ ہم ایک نان پرفیکٹ دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں 100٪ پرفیکشن کا حصول ناممکن ہے۔ اور ہمیں (انسانیت) کو سروائیو کرنے کے لیے 100٪ پرفیکٹ اخلاقیات کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

آخر میں، شک کرنے سے ڈریں نہیں۔ یہی انسانیت کا راستہ ہے۔

مذہبی مفکرین کے دعوے کا تجزیہ کہ خدا کے بغیر اخلاقیات ممکن نہیں

مذہبی مفکرین کا دعویٰ ہے کہ خدا کے بغیر اخلاقیات کی کوئی ٹھوس بنیاد (Foundation) نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، ان کے نزدیک ایک ایتھیئسٹ کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی مذہب (مثلاً اسلام) کے اخلاقی احکامات پر کوئی تنقید کر سکیں۔

اپنے اس دعوے کے دفاع میں مذہبی حضرات ذیل کے 3 آرگومینٹز پیش کرتے ہیں۔

1. Subjective vs Objective Morality (مذہبی حضرات کا دعویٰ کہ خدا کے بغیر سب کچھ subjective بن جاتا ہے)

2. جوابدہی کی ضرورت (یعنی آخرت میں جنت کی لالچ اور جہنم کا خوف آپ کو اخلاقی طور پر بہتر انسان بناتا ہے)

3. Is vs Ought کا مسئلہ (یعنی سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ انسان "کیا" ہے، مگر وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی کہ اسے "کیسا" ہونا چاہیے)

مذہبی حضرات کی پہلی دلیل: Subjective vs Objective Morality

مذہبی مفکرین کے مطابق خدا کے بغیر اخلاقیات محض "انسانی رائے" (Subjective Morality) بن کر رہ جاتی ہیں۔ اگر خدا نے قتل کو برا نہیں کہا، تو یہ صرف ہماری پسند یا ناپسند ہے کہ قتل کو اچھا سمجھیں یا برا۔ ایک شخص کے لیے جو چیز "برائی" ہے، دوسرے کے لیے وہ "اچھی" ہو سکتی ہے۔ اگر اکثریت یہ طے کر لے کہ کسی خاص گروہ کو مارنا درست ہے، تو ایک غیر مذہبی نظام (ایتھیئسٹ معاشرے) میں اسے غلط ثابت کرنے کا کوئی "حتمی پیمانہ" نہیں ہو گا۔ چنانچہ صرف ایک مطلق ہستی (خدا) ہی ہمیں وہ معروضی اخلاقیات (Objective Morality) کا پیمانہ دے سکتی ہے جو ہر زمان و مکان میں یکساں رہے۔

ہمارا جواب:

پہلی بات یہ ہے کہ جب ہم کسی کو تکلیف میں دیکھتے ہیں، تو ہمارے دماغ میں وہی حصے متحرک ہوتے ہیں جو ہماری اپنی تکلیف میں متحرک ہوتے ہیں۔

ارتقائی طور پر ہماری انسانی سپیشیز نے بقا ہی اس لیے پائی ہے کیونکہ اس میں دوسروں انسانوں کے لیے ہمدردی اور ان کا دکھ محسوس کرنے کا جبلی رجحان کہیں زیادہ ہے خود غرضی یا دوسرے کسی ایسے رجحان سے کہ جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ جن انسانی گروہوں میں تعاون اور ہمدردی زیادہ تھی، وہ زیادہ کامیاب رہے اور ان کی نسلیں آگے بڑھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہماری انسانی نوع ارتقا کے دوران ہی ختم ہو چکی ہوتی۔

ہماری "عقل" وہ ذریعہ بنی جس کی وجہ سے ہم جانوروں سے ممتاز ہوئے اور ہماری بقا کے چانسز دیگر تمام جانوروں سے کہیں زیادہ بڑھ گئے۔ یعنی ہماری عقل نے ہمارے ہمدردی کے جبلی رجحان کو کہیں زیادہ فوقیت دی دوسروں کو تکلیف دینے کے رجحان پر، کیونکہ اس سے ہماری بقا جڑی ہوئی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذہبی حضرات فقط ایسی "فرضی دنیا" کی داستان گھڑ رہے ہیں کہ جس کا ہماری "عملی دنیا" کے حالات و واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جی ہاں، وہ ایک ایسی **فرضی دنیا** کھڑی کر رہے ہیں کہ جہاں جیسے ایتھیئسٹ کل سے ہی قتل کو اچھا کہنا شروع ہو جائیں گے۔

مگر ہزاروں سال کی انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہر ہر معاشرے میں (چاہے وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی)، اخلاقیات کے معیار ہمیشہ انیس بیس کے معمولی سے فرق کے ساتھ تقریباً ہمیشہ یکساں ہی رہے ہیں۔ چنانچہ، پوری انسانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ جہاں مذہبی معاشرے قتل کو مکمل ختم کر رہے ہوں جبکہ غیر مذہبی معاشرے قتل کو مکمل جاری کر رہے ہوں۔ اور اخلاقیات کی اس یکسانیت کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات کبھی بھی آسمان سے نہیں اتریں، بلکہ وہ انسانوں نے ہمیشہ خود ہی بنائیں چاہے وہ مذہبی معاشرے ہوں یا غیر مذہبی۔

بلکہ اس کا الٹ دیکھنے میں آیا کہ کچھ غیر مذہبی معاشروں (مثلاً کنفیوشس، تاؤ اور بدھ مت وغیرہ) میں انسانیت کا معیار کہیں بلند رہا بہ نسبت مذہبی معاشروں کے۔

چنانچہ جب مذہبی حضرات اپنے دعوے میں ایسا تاثر پیش کرتے ہیں کہ جیسے کسی خدا اور مذہب کے بغیر غیر مذہبی معاشرے بالکل حیوان بن جاتے ہیں، تو وہ فقط لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایک ایسا مفروضہ پیش کر رہے ہوتے ہیں کہ جس کا ہماری عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور اس کی تکذیب انسانی تاریخ (empirical history) پہلے ہی مکمل طور کر چکی ہے۔

نیز، خدا کی طرف منسوب اخلاقیات خود تاریخ میں بدترین مظالم کو justify کرتی رہی ہیں۔ مثلاً اسلام کے پیغمبر محمد صاحب اپنے مخالفین پر 100٪ تباہی لاتے تھے۔

- وہ اپنے مخالفین کے تمام کے تمام مردوں کو قتل کر ڈالتے تھے، یا پھر غلام بنا لیتے تھے۔
- اور وہ ان کی تمام کی تمام عورتوں کو غلام باندیاں بنا لیتے تھے، اور پھر اپنے ساتھیوں کے لیے ان کا جنسی استحصال حلال کر دیتے تھے۔ یہ 100٪ تباہی ہے حالانکہ ان عورتوں کا جنگوں میں کوئی قصور نہیں ہوتا تھا۔
- اور وہ ان کے چھوٹے بچوں کو بھی نہیں بخشتے تھے اور تمام کے تمام بچوں کو بھی زندگی بھر کے لیے غلام بنا لیتے تھے، حالانکہ ان کے چھوٹے بچوں کا بھی جنگوں میں کوئی کردار نہیں ہوتا تھا اور وہ معصوم ہوتے تھے۔
- اور پھر محمد صاحب اپنے مخالفین کی تمام زمین و جائیداد و مال و دولت لوٹ لیتے تھے اور ایک دھیلہ تک نہیں چھوڑتے تھے۔

چنانچہ یہ ایک مکمل تباہی ہے اور کوئی غیر مذہبی معاشرہ شاید ہی اس سے زیادہ تباہی لا سکتا ہو۔

مثلاً مالِ غنیمت کے حصول کی خاطر مسلمانوں نے 5 ہجری میں بنو مصطلق کے قبیلے پر حملہ کر دیا جبکہ وہ مکمل طور پر غفلت کی حالت میں تھے۔

صحیح بخاری، 2541 اور صحیح مسلم 1730a:

ابن عون کہتے ہیں کہ انہوں نے نافع کو لکھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ کفار پر حملہ کرنے سے قبل انہیں اسلام کی دعوت دی جائے؟ اس پر نافع نے جواب دیا کہ یہ چیز اوائل اسلام میں تھی، مگر بعد میں رسول نے بنو المصطلق پر بالکل غفلت کی حالت میں حملہ کر دیا (یعنی کوئی دعوت نہیں دی) اور ان کے مویشی پانی پی رہے تھے۔ ان کے لڑنے والوں کو قتل کیا گیا اور تمام عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا گیا (غلام بنالیا گیا)۔

صحیح بخاری 3012:

قَالَ مَرَّ بِيَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِالأَبْوَاءِ ـ أَوْ بِوَدَّانَ ـ وَ سُئِلَ عَنْ أَهْلِ الدَّارِ يُبَيَّتُونَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، فَيُصَابُ مِنْ نِسَائِهِمْ وَذَرَارِيِّهِمْ قَالَ "هُمْ مِنْهُمْ". وَسَمِعْتُهُ يَقُولُ "لاَ حِمَى إِلاَّ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ

صعب بن جثامہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابواء یا ودّان کے مقام پر میرے پاس سے گزر ہوا **تو آپ سے ان مشرکوں کے بچوں اور عورتوں کے بارے میں دریافت کیا گیا جو رات کو اپنے گھروں میں سوئے ہوتے ہیں اور (بوقتِ شب خون) قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ بھی تو ان ہی میں سے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "محفوظ چراگاہیں (عربی: حمي)" صرف اللہ اور اس کے رسول کی ملکیت ہیں۔**

"حِمی" (محفوظ چراہگاہ) قدیم عرب قبائلی معیشت میں صرف چراگاہ نہیں تھی، بلکہ یہ **طاقت کی علامت** تھی۔ "حِمی" سے مراد وہ محفوظ چراگاہیں اور علاقے تھے جنہیں قبائل صرف اپنے مویشیوں کے لیے مخصوص کرتے تھے۔ کسی دوسرے قبیلے کی "حِمی" پر قبضہ کرنا یا اپنی "حِمی" کا دائرہ بڑھانا، ایک **واضح سیاسی اعلان** ہوتا تھا کہ قبضہ کرنے والا قبیلہ اب زیادہ طاقتور اور بااثر ہے۔

محمد صاحب کا بنو مصطلق کی زرخیز زمینوں پر حملہ اور انکی "حِمی" (چراہگاہوں) پر قبضہ اسی قدیم زمانہ جاہلیت کے جنگل کے قانون (Might is Right) کو رائج کرنا تھا، مگر محمد صاحب نے اس جنگ کے قانون کو صرف یہ **مذہبی**

رنگ دے دیا کہ غیر مسلموں کی زمینوں اور "حِمی" پر حملہ اور قبضہ اس لیے حلال ہے کیونکہ تمام چراگاہیں اللہ اور اس کے رسول کی ملکیت ہیں۔

چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اخلاقیات بعینہ وہی کی وہی ہی رہیں کہ پرسنل فائدے کی خاطر دوسروں پر حملہ کرنا درست ہے، مگر فرق صرف اتنا پڑا کہ پرسنل فائدے کی خاطر قتل و غارت اور لوٹ مار کو یہاں مذہبی رنگ دے کر حلال بنا لیا گیا۔

نیز امریکہ آج طالبان کے دہشتگردوں پر ڈرون حملے کرتا ہے اور دہشتگردوں کے ساتھ مرنے والے معصوموں کو 'کولیٹرل نقصان' قرار دیتا ہے۔ مگر مسلمان امریکہ کی اس 'کولیٹرل نقصان' والی تھیوری کو قبول نہیں کرتے۔ مگر کیا یہی مسلمان اپنے نبی کی اسی کولیٹرل نقصان والی تھیوری کو بھی رد کر سکتے ہیں یا پھر چراگاہوں کی خاطر وہ محمد صاحب پر عورتوں اور بچوں کے قتل کو "اخلاقیات" کا نام دے دیں گے؟

مذہبی حضرات کی دوسری دلیل: کسی "جوابدہی" کے بغیر انسان اپنی خواہشات کو کیوں قربان کرے

مذہبی حضرات کا اگلا آرگومینٹ یہ ہے کہ اگر مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں اور کوئی جزا و سزا کا نظام نہیں، تو ایک انسان کے پاس اپنی خواہشات قربان کر کے "نیک" بننے کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔ اگر ایک ظالم شخص دنیا میں عیش کر کے مر جائے اور ایک مظلوم تڑپ کر جان دے دے، اور انجام کار دونوں مٹی ہو جائیں، تو اخلاقیات ایک "بے معنی بوجھ" لگتی ہیں۔ مذہب کے مطابق "خدا کا خوف" ہی وہ واحد طاقت ہے جو انسان کو "تنہائی" میں بھی برائی سے روکتی ہے۔

ہمارا جواب:

مذہبی حضرات کے دعوے کے برعکس اخلاقیات کبھی بھی "بے معنی بوجھ" اس لیے نہیں لگتیں کیونکہ دوسروں کے لیے ہمدردی دکھانے اور ان کی مدد کرنے سے صرف دوسروں کو ہی فائدہ نہیں ہو رہا ہوتا ہے، بلکہ خود ہمیں

بھی فائدہ ہورہاہوتاہے اور ہمیں بھی "**سکون اور خوشی**" مل رہی ہوتی ہے۔ یہ سکون اور خوشی فوری اور حقیقی ہے، نہ کہ مرنے کے بعد کا وعدہ۔

اور یہ "سکون اور خوشی" ہمیں اس وقت بھی ملتی ہے جب ہم "تنہائی" میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر تنہائی (یا چھپ کر بھی) ہم کوئی جرم کریں کہ جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے، تو پھر بھی اس تنہائی کے جرم پر بھی ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کررہاہوتاہے اور ہم پر ایک "بوجھ" ہوتاہے۔

تحقیق بتاتی ہے کہ جن لوگوں کو "دوزخ کا خوف" زیادہ ہو، وہ ضروری نہیں کہ زیادہ اخلاقی ہوں۔ مثلاً جیلوں میں قیدیوں کا سروے دیکھیں:

- مذہبی لوگوں کا تناسب غیر مذہبی لوگوں سے زیادہ ہے
- امریکہ میں قیدیوں کا 85-90٪ مذہبی ہیں، جبکہ ایتھیئسٹ صرف 1٪ سے بھی کم (جبکہ امریکہ میں ایتھیئسٹ آبادی کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے)

حوالہ: Are Prisoners Less Likely To Be Atheists? - FiveThirtyEight

مذہبی حضرات کی تیسری دلیل: "ہونا" (Is) اور "ہوناچاہیے" (Ought) کا مسئلہ

مذہبی حضرات کا تیسرا اور آخری آرگومینٹ یہ ہے کہ سائنس اور ارتقاء ہمیں یہ تو بتاسکتے ہیں کہ انسان "کیاہے" (Is)، لیکن وہ یہ کبھی نہیں بتاسکتے کہ انسان کو "کیساہوناچاہیے" (Ought)۔ ارتقاء ہمیں یہ بتاسکتاہے کہ رحم دلی سے قبیلہ مضبوط ہوتاہے، لیکن وہ یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ رحم کرنا ایک "اخلاقی فریضہ" ہے۔ مذہب کا دعویٰ ہے کہ یہ "فریضہ" یا "حکم" صرف ایک بلند ہستی (خدا) کی طرف سے ہی آسکتاہے جو مادے سے بالاتر ہو۔

ہمارا جواب:

ہمارا جواب وہی ہے جو کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ ارتقاکے نتیجے میں ہمارے جسم میں پیدا ہونے والے ہارمونز کی وجہ سے پیدا ہونے والے رجحانات اور ہماری عقل مل کر ہمیں صرف یہ نہیں بتلاتے کہ ہم انسان "کیاہیں"، بلکہ

یہ آگے بڑھ کر ہماری اس طرف بھی رہنمائی کرتے ہیں کہ ہمیں "کیسا" ہونا چاہیے کہ جس کی وجہ سے ہمیں "دلی سکون اور خوشیاں" ملیں گی، اور ہمیں "کیسا نہیں" ہونا چاہیے کہ جس کی وجہ سے ہمیں اپنے اندر موجود انسانیت (ضمیر) کی ندامت اور ملامت کا سامنا ہو۔

گوتم بدھ: کسی "آسمانی خدا" کے بغیر غیر مذہبی اخلاقی انقلاب

مذہبی طبقے کے اس پروپیگنڈے کے برعکس کہ "خدا کے بغیر اخلاقیات ممکن نہیں"، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانیت کا احساس تمام مذاہب اور دیوتاؤں (بشمول اللہ) کے تصور سے کہیں زیادہ قدیم اور مقدم ہے۔ اس کی روشن ترین مثال **گوتم بدھ** کی شخصیت ہے۔

بدھ کسی خالق خدا پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کوئی فرشتہ کوئی آسمانی وحی لے کر ان کے پاس آتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنی تمام تر تعلیمات کا سرچشمہ اپنے **اندرونی دکھ، ہمدردی (Empathy) اور اپنی انسانی عقل اور غور و فکر** کو بنایا۔

بدھ نے ہندومت کی اس وقت کی نام نہاد "مقدس اور ابدی اخلاقیات" کو چیلنج کیا جو 'ذات پات' جیسے غیر انسانی نظام کو عین مذہب قرار دیتی تھی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ خیر اور شر کی تمیز کے لیے انسان کے اندر موجود "انسانیت" ہی کافی ہے۔

کیا بدھ کی اخلاقیات سو فیصد کامل تھیں؟ یقیناً نہیں، کیونکہ ان پر ان کے عہد کے ثقافتی اثرات موجود تھے۔ لیکن اصل نکتہ یہ ہے کہ انسانی ضمیر پر مبنی ان "نامکمل" اخلاقی اصولوں نے ہمیشہ ان "مقدس" مذہبی اخلاقیات کے تضادات کو بے نقاب کیا ہے جو صدیوں تک غلامی اور طبقہ واریت جیسے مظالم کو الہامی لبادہ اوڑھا کر جائز قرار دیتے رہے ہیں۔

یاد رکھیے اس دنیا میں 100٪ معروضی (Objective) اخلاقیات کا وجود ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی 100٪ پرفیکٹ دنیا میں نہیں جی رہے ہیں۔ مذہب کا یہ دعویٰ کہ اس کی اخلاقیات 100٪ پرفیکٹ ہیں، سوائے ایک سراب اور دھوکے کے اور کچھ نہیں۔

یہاں ہم مسلم مبلغین کے سامنے چند سوالات رکھتے ہیں:

1. کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ گوتم بدھ ایک اعلیٰ اخلاقی نظام کے حامل تھے؟ یا آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ بدھ مت کے پاس اخلاقیات کا کوئی فریم ورک ہی نہیں کیونکہ وہ کسی خدائی ہستی پر یقین ہی نہیں رکھتے؟

2. کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ بدھ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی انسانیت اور عقل کی بنیاد پر ہندو مت کی "مروجہ مذہبی اخلاقیات" پر تنقید کریں؟

اگر آپ کا جواب "ہاں" ہے، تو پھر اسلام کی اخلاقیات پر انسانی عقل کی بنیاد پر تنقید کرنا "غلط" کیسے ہو گیا؟

یہ تضاد کیوں ہے کہ بدھ کو تو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی عقل سے ویدوں اور ذات پات کے نظام کو پرکھیں، لیکن ایک جدید ایتھیئسٹ یا مفکر کو یہ حق نہ دیا جائے کہ وہ اسی انسانی عقل کی بنیاد پر اسلام کے احکاماتِ ارتداد، غلامی اور باندیوں کے تصور پر سوال اٹھائے؟

یہ رویہ "دوغلے پن" (Double Standards) کی بدترین مثال ہے۔ اگر انسانی عقل ہندو مت کو پرکھنے کا پیمانہ ہو سکتی ہے، تو وہ اسلام یا کسی بھی دوسرے مذہب کو پرکھنے کے لیے بھی اتنی ہی بااختیار ہے۔

خدا کے بغیر زندگی کے معنی اور مقصد کیا ہیں؟

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ **فطرت کا اپنا کوئی موروثی مقصد نہیں ہے**۔ جب مذہبی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ زندگی ایک بلٹ ان، پہلے سے طے شدہ مقصد کے ساتھ آتی ہے، تو یہ دعویٰ حقیقت کے بارے میں ہمارے مشاہدات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ وضاحت نہیں کر سکتے:

- کائنات بگ بینگ کے ساتھ کسی ظاہری ہدف یا سمت کے بغیر کیوں شروع ہوئی، یا کیوں اربوں سالوں میں **کھربوں ستارے پیدا ہوتے اور مرتے ہیں** بغیر کسی مقصد کے جو ان کے وجود سے منسلک ہو؟ ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ کائنات کسی خاص اخلاقی یا وجودی مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے۔
- زمین پر زندگی بے ترتیب عمل کے ذریعے نمودار ہوئی، جو صرف "زندگی کی بقا" کی جبلت سے چلتی ہے۔
- ارتقاء معنی، انصاف یا انسانی اقدار کی طرف کام نہیں کرتا۔ یہ صرف "زندگی کی بقا" کی طرف کام کرتا ہے۔
- اگر زندگی کا واقعی کوئی موروثی مقصد ہوتا، تو پھر یہ پوچھنا ضروری ہے کہ **ان بے شمار سپیشیز کا کیا مقصد تھا جو انسانوں سے بہت پہلے موجود تھیں مگر پھر ختم ہو گئیں؟** زمین پر بسنے والی تمام سپیشیز کا تقریباً 99٪ اب معدوم ہو چکا ہے۔ ڈائینا سور نے لاکھوں سال تک کرہ ارض پر حکمرانی کی مگر انسانوں کے ظہور سے بہت پہلے 65 ملین سال قبل غائب ہو گئے۔ ان کا مقصد کیا تھا؟

لہٰذا، **مقصد فطرت میں خود نہیں لکھا گیا ہے**۔ فطرت زندگی پیدا کرتی ہے، اسے تبدیل کرتی ہے، اور بغیر کسی وضاحت یا تشویش کے اسے مٹا دیتی ہے۔ معنی کائنات میں کسی خفیہ پیغام کی طرح دریافت نہیں کیے جاتے۔

یہ صرف ارتقاء (EVOLUTION) ہے جس نے معنی (MEANING) کے لیے ہماری تلاش کو تشکیل دیا۔

ارتقائی نقطہ نظر سے، زندگی کا بنیادی مقصد "بقا" تھا۔

ہاں، انسانوں نے قدرتی جسمانی عمل کے ذریعے مقصد تلاش کرنے کے لیے ارتقاء پایا۔ ہمارے دماغ ڈوپامائن، سیروٹونین اور اینڈورفنز جیسے کیمیکل خارج کرتے ہیں جب ہم دوسروں کی مدد کرتے ہیں، ذاتی اہداف حاصل کرتے ہیں، اور گہرے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ یہ میکانزم تکمیل کا قدرتی احساس فراہم کرتے ہیں، جس میں کسی خدائی مداخلت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس وجہ سے، سیکولر زندگی میں معنی کے ذرائع کچھ یوں ہیں:

1. **انسانی تعلقات:** ہم نے اس طرح ارتقاء پایا ہے کہ محبت، دوستی اور خاندان ہمیں گہرا اطمینان فراہم کرتے ہیں (یعنی ہارمونز کام کرتے ہیں)۔
2. **ذاتی ترقی اور سیکھنا:** فکری تجسس، مہارت کی نشوونما، اور چیلنجوں پر قابو پانا ہمارے لیے کامیابی کا احساس پیدا کرتا ہے (یعنی ہارمونز کام کرتے ہیں)۔
3. **معاشرے میں حصہ ڈالنا:** بہت سے ایتھیئسٹ سائنس، آرٹ، طب یا سماجی انصاف میں مقصد تلاش کرتے ہیں۔ عظیم تر بھلائی کے لیے کام کرنا ایک دیرپا میراث چھوڑتا ہے (یعنی ہارمونز کام کرتے ہیں)۔

مشرقی ایشیا میں، غیر مذہبی (ایتھیئسٹ) فلسفے جیسے **کنفیوشس ازم، تاؤازم اور بدھ ازم** خدائی قانون ساز پر انحصار کیے بغیر اخلاقی فریم ورک فراہم کرتے ہیں۔ یہ نظام **سماجی ہم آہنگی، فرض اور فطرت کے ساتھ توازن میں رہنے** پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

مثلاً:

- کنفیوشس ازم سکھاتا ہے کہ زندگی میں معنی معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے سے آتا ہے، یعنی ایک اچھا بیٹا، ذمہ دار باپ، یا نیک شہری ہونا۔ اخلاقیات کی جڑیں انسانی تعلقات میں ہیں، خدائی احکام میں نہیں۔

- تاؤازم قدرتی دنیا کے ساتھ ہم آہنگی میں رہنے پر زور دیتا ہے۔ معنی زندگی کی روانی سے اخذ کیا جاتا ہے، کسی بیرونی دیوتا سے نہیں۔

یہ معاشرے ثابت کرتے ہیں کہ **انسان دوستی اور اخلاقیات کسی بھی "خدا" کے بغیر ترقی کر سکتی ہیں۔** انہوں نے صدیوں پہلے خدائی حکم کو سماجی اور قدرتی ہم آہنگی سے بدل دیا تھا۔

خدا کے بغیر طاقتور ظالم کے خلاف انصاف کیسے ملے گا؟

مذہبی لوگ استدلال کرتے ہیں کہ خدا کے بغیر کوئی حتمی انصاف نہیں ہو سکتا۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ طاقتور ظالم اور بدکار سزا سے بچ جائیں گے اور متاثرین کو کبھی انصاف نہیں ملے گا۔

تاہم، **تاریخ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خدائی انصاف بڑی حد تک ایک وہم ہے۔** جنگیں، نسل کشی، غلامی اور اجتماعی ظلم و ستم تمام ادوار میں ہوئے ہیں، بشمول گہرے مذہبی ادوار کے۔ یہ مظالم خدا پر یقین کی موجودگی میں نہ تو رکے، نہ سست ہوئے، اور نہ ہی خود کو درست کیا۔

اگر واقعی کوئی خدائی منصف موجود ہوتا اور فعال طور پر مداخلت کرتا، تو ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے: **اتنی بڑی اور طویل تکلیف بغیر روک ٹوک کے کیوں جاری ہے؟** بے گناہ لوگ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں جبکہ مجرم اکثر اپنی سوسائٹیوں میں عزت پاتے ہوئے پرامن طریقے سے مر جاتے ہیں؟

مسئلہ اس وقت اور بھی پریشان کن ہو جاتا ہے جب ہم **شدید معذوری یا جان لیوا بیماریوں کے ساتھ پیدا ہونے والے بچوں** پر غور کرتے ہیں۔ ان بچوں کو ان کی رضامندی کے بغیر وجود میں لایا جاتا ہے، وہ اپنی مختصر زندگیوں میں درد برداشت کرتے ہیں، اور اکثر ابتدائی بچپن میں ہی مر جاتے ہیں۔ انہوں نے کیا جرم کیا جو انہیں ایسے بے دردی اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا؟ یہاں کون سا اخلاقی سبق سکھایا جا رہا تھا؟

مذہبی حضرات یہ کہہ کر فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تکلیف "اللہ کی طرف سے ایک **امتحان**" ہے۔ لیکن یہ وضاحت اپنی ہی منطق کے تحت گر جاتی ہے۔ اسلامی الہیات میں، انعام **نیت** پر مبنی ہے (ان الاعمال بالنیات: اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)۔ وہ بچہ جس نے پیدا ہونے کا انتخاب نہیں کیا، تکلیف اٹھانے کا انتخاب نہیں کیا، اور کسی آزمائش کے لیے رضامندی نہیں دی، اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی کوئی **نیت** تھی۔ **تو پھر یہ کس قسم کا امتحان ہے، اور کس کے لیے؟**

اگر تکلیف کا مقصد دوسروں کو آزمانا ہے، تو بچہ محض ایک آلہ بن جاتا ہے، جو کسی اور کی روحانی نشو و نما کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس کا مقصد بچے کو آزمانا ہے، تو انصاف کا تصور اپنے تمام معنی کھو دیتا ہے، کیونکہ وہاں کوئی انتخاب، کوئی رضامندی اور کوئی اختیار اور کوئی نیت ہی نہیں تھی۔

ایک اور حقیقت یہ ہے کہ انصاف کے مذہبی تصورات اکثر "مابعد الطبیعاتی" (metaphysical) ہوتے ہیں، جو اگلی دنیا تک موخر کر دیے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ خیال لوگوں کو مفلوج کر سکتا ہے، اور انہیں ابھی اور اسی وقت ناانصافی کے خلاف لڑنے سے حوصلہ شکنی کر سکتا ہے۔

ایتھیزم یہ احساس لاتا ہے کہ کائنات کے تانے بانے میں کوئی "موروثی انصاف" نہیں بُنا گیا ہے۔ انصاف ایک انسانی قدر ہے، جسے ہم نے ارتقاء کے عمل کے ذریعے تخلیق کیا ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ ہم امن کے ساتھ مل کر رہ سکیں۔ جب ہم یہ قبول کر لیتے ہیں کہ کوئی غیبی ہاتھ ہمیں بچانے نہیں آ رہا، تو ہم زیادہ ذمہ دار بن جاتے ہیں۔ ہم خود قوانین لکھتے ہیں، عدالتی نظام کو بہتر کرتے ہیں، اور انسانی حقوق کے لیے لڑتے ہیں۔ انصاف کی تحریک آسمانوں سے نہیں اترتی، بلکہ یہ ہمارے اندرونی ہمدردی کو منظم کرنے والے ہارمونز اور سماجی بقا کی ہماری عملی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔

سیکولر معاشروں نے طاقتوروں کا احتساب کرنے کے لیے قانونی نظام، انسانی حقوق کے فریم ورک اور سماجی اصول وضع کیے ہیں۔

آیئے غیر مذہبی انصاف کی ایک مثال دیکھتے ہیں۔

- جاپان میں دنیا میں جرائم کی شرح سب سے کم ہے، باوجود اس کے کہ وہ غیر مذہبی ہے۔ عالمی تنظیموں کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جاپان کے شہری دنیا میں سب سے زیادہ ایماندار ہیں۔ اگر کوئی ٹرینوں یا عوامی مقامات پر قیمتی سامان چھوڑ دیتا ہے، تو جاپانی شہری انہیں پولیس کو واپس کر دیتے ہیں۔ ہر سال، ٹوکیو کے رہائشی لاکھوں ین حکام کے حوالے کرتے ہیں۔ (لنک: ٹوکیو کے شہری سب سے زیادہ ایماندار ہیں)

- اسکینڈینیوین ممالک، جو سب سے کم مذہبی ہیں، شفافیت میں سب سے اوپر اور کرپشن میں سب سے نیچے ہیں۔ بین الاقوامی عدالتیں اور انسانی حقوق کی تنظیمیں جنگی مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے کام کرتی ہیں، قطع نظر ان کے مذہبی عقائد کے۔

سیکولر معاشروں میں، اخلاقیات تعلیم، ہمدردی اور سماجی ذمہ داری کے ذریعے سکھائی جاتی ہے۔ لوگ اخلاقی طور پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ انہیں سزا کا خوف ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ہم آہنگی اور انصاف کی قدر کو سمجھتے ہیں۔

لہذا، مذہبی لوگوں کو جواب دینا ہو گا کہ اگر خدا کے بغیر انصاف کا کوئی احساس موجود نہیں ہو سکتا، تو پھر غیر مذہبی معاشروں نے ایسے منصفانہ معاشرے کیسے قائم کیے، جو اس معاملے میں مذہبی معاشروں سے بھی آگے ہیں؟

خدا کے بغیر مشکل حالات کا سامنا

مذہبی حضرات یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانیت کو ایتھیئزم سے بچانا بہت ضروری ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ مصیبت میں مبتلا افراد کو صبر پیدا کرنے کے لیے سہارے اور امید کی ضرورت ہوتی ہے، جو ان کے بقول ایتھیئزم میں موجود نہیں ہیں۔

تاہم، چین، جاپان، ویتنام اور افریقہ کے کچھ حصوں جیسے متعدد **غیر مذہبی ایتھیئسٹ معاشرے** ہزاروں سالوں سے ترقی کر رہے ہیں۔ اگر سروائیو اور زندہ رہنے کے لیے خدائی امیدوں پر انحصار ضروری ہوتا تو یہ معاشرے صدیوں پہلے معدوم ہو چکے ہوتے۔

مشکل حالات کا سامنا خدا کے سہارے نہیں، بلکہ "انسانی دماغ" کے سہارے کیے جاتا ہے۔

انسانی دماغ مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لیے ضروری مدد اور تیاری فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر، موت کے امکان کا سامنا کرتے وقت، یہ دماغ ہی ہے جو عقلی توجیہ پیش کرتا ہے اس دنیا میں موت ایک "حقیقت" ہے۔ اور جب انسان یہ حقیقت ذہنی طور پر قبول کر لیتا ہے، تو پھر وہ موت کا سامنا کرتے ہوئے بھی "پُرسکون" ہو جاتا ہے۔

نتیجتاً، ایتھیئسٹ حضرات اکثر اپنے مذہبی ہم منصبوں کے مقابلے میں موت کے وقت زیادہ سکون کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دیکھئے: [Euthanasia سے پہلے زیادہ تر غیر مذہبی لوگوں کے انٹرویوز جہاں وہ پرسکون ہیں کیونکہ وہ ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار ہیں]۔

اسی طرح، جب کسی طاقتور کی طرف سے **ناانصافی** کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو دماغ ہمیں ذہنی طور پر تیار کرتا ہے کہ کائنات موروثی طور پر انصاف کے اصولوں پر کام نہیں کرتی ہے اور اس لیے یہ دنیا 100٪ پرفیکٹ نہیں ہے۔ اور اس میں کچھ نہ کچھ ظلم اور ناانصافی ہمیشہ باقی رہے گی۔ چنانچہ دماغ ناانصافی کے سامنے **استقامت** اور **صبر** کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اور ایسے مسائل کا سامنا کرنے اور ان سے نمٹنے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔

چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی مشکل صورت حال نہیں ہے جس کے لیے انسانی دماغ کسی فرد کو تیار نہ کر سکے۔ ایک بار ذہنی طور پر تیار ہونے کے بعد، افراد کو کسی دیوتا سے اضافی بیرونی امیدوں یا مدد کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ پُرسکون ہو جاتا ہے۔ چین، جاپان، ویتنام اور کوریا کے ایتھیئسٹ صدیوں سے خدا کے بغیر مشکل حالات کا کامیابی سے سامنا کرتے آ رہے ہیں اور انہیں ایسے مشکل حالات میں بھی کبھی کسی خدا سے دعا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

نوٹ: بدھ مت کے ماننے والے بدھ کو کوئی الٰہی یا ماورائی طاقتوں والا خدا نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک عام انسان ہی مانتے ہیں جیسے کہ ہم

بدھ مت میں، جو چیز بیرونی لوگوں کو "**دعا مانگنا**" لگ سکتی ہے، وہ در حقیقت دعا نہیں بلکہ صرف "**تعظیم کا عمل**" ہوتی ہے۔ بدھ مت کے ماننے والے کسی الٰہی مداخلت کی درخواست نہیں کرتے۔ اسلام کے برعکس، جہاں مسلمان اللہ سے واقعات کو بدلنے، معجزے دکھانے، یا تقدیر تبدیل کرنے کی دعا کرتے ہیں، بدھ مت کے ماننے والے یہ نہیں مانتے کہ بدھا کوئی ایسا خدا ہے جو ماورائی طاقتوں سے مالا مال ہو اور دنیا میں مداخلت کر سکے۔ بدھا کو صرف ایک عظیم استاد سمجھا جاتا ہے جس نے آزادی (نروان) کا راستہ دریافت کیا اور سکھایا، کوئی ایسا نہیں جو دوسروں کی طرف سے یہ راستہ طے کر سکے۔

جب بدھ مت کے ماننے والے مشکل وقتوں میں سجدہ کرتے ہیں، منتر پڑھتے ہیں، یا مراقبہ کرتے ہیں، تو وہ بدھ سے اپنی مشکلات حل کرنے یا بیرونی حالات بدلنے کی درخواست نہیں کر رہے ہوتے۔ بلکہ وہ اس کے ذریعے صرف بصیرت کی تعظیم کرتے ہیں اور ان طریقوں کو استعمال کرتے ہیں تاکہ اندرونی صفات جیسے سکون، صبر، آگہی، اور صاف گوئی پیدا کر سکیں۔ بدھ مت سکھاتا ہے کہ زندگی کرما، یعنی عمل اور ردعمل کے قانون کے مطابق چلتی ہے، یعنی مستحکم تبدیلی صرف اپنے اعمال، سمجھ، اور ذہنی حالت سے آ سکتی ہے۔ اس معنوں میں، بدھ مت کا طریقہ کار کسی ماورائی نجات کی التجا نہیں بلکہ مصیبت کے وقت دانشمندی اور اندرونی سکون کے ساتھ دماغ کو پرسکون کرنے کا طریقہ ہے۔

اختتامیہ

اس کتابچے میں ہم نے ان تمام فکری مغالطوں کا علمی محاکمہ کیا ہے جو انسانی عقل کو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے رکھتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کائنات کی تخلیق، انسانی امتحان اور جبر و اختیار کے تصورات کس طرح منطقی تضادات کا شکار ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے ان نفسیاتی خدشات کا بھی جواب تلاش کیا ہے جو اکثر مذہب چھوڑنے کے بعد انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ **خدا کے بغیر زندگی ہرگز بے مقصد نہیں ہوتی**، بلکہ یہ ہمیں اپنا مقصد خود متعین کرنے کی آزادی دیتی ہے۔ **خدا کے بغیر انصاف** کا تصور ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم کسی غیبی قوت کا انتظار کرنے کے بجائے اسی دنیا میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے خود جدوجہد کریں۔ اور **مشکل حالات، بیماری یا صدمے** میں کسی خیالی سہارے کے بجائے حقیقی انسانی ہمدردی، سائنسی فہم اور باہمی تعاون ہی ہمارا اصل اثاثہ ہیں۔

حرفِ آخر:

دین کی ناموس اور اللہ کی "مبینہ دانائی" کی خاطر اپنی انسانیت اور عقل کا گلا نہ گھونٹیں۔ سچائی کی تلاش کا راستہ مشکل ضرور ہے مگر یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں خوف کی بستی سے نکال کر شعور کی روشنی میں لاتا ہے۔ یاد رکھیں، انسانیت تمام مذاہب سے مقدم ہے اور ہماری اپنی عقل ہی ہماری سب سے بڑی رہنما ہے۔

پیشکش:

پاکستانی فری تھنکرز فیس بک گروپ

ویب سائیٹ کو بھی لازمی وزٹ کیجیے:

https://atheism-vs-islam.com